بار اول ۱۵۰۰   کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی   قیمت تین روپیے

سنہ ۴۶ء

لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی

فہرست

نذر

اپنے عزیز ترین دوست کو

جو زندگی کے سفر میں میرا رفیق بھی ہے اور رہنما بھی
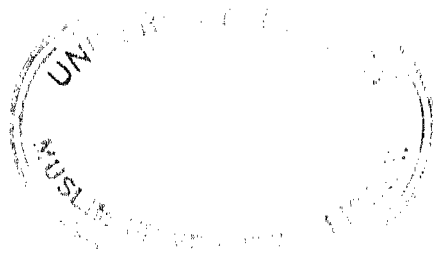
دیباچہ

ساز ہستی میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ کوئی تین سال ہوئے مرتب ہو چکا تھا لیکن اول تو کاتب کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور پھر کاغذ نایاب۔ اور اگر ملتا بھی تھا تو بہت خراب اس لئے مسودہ اب تک میری میز کی دراز میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں کئی اور افسانے لکھے مگر انھیں اس مجموعے میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا چنانچہ اس میں صرف وہی افسانے ہیں جو اب سے تین سال پہلے لکھے گئے تھے۔

پہلا افسانہ سنبھالا رسالہ ادیب میں شائع ہوا تھا۔ رقاصہ ساقی میں چھپا تھا۔ یہ ہندوستان۔ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاری نے اس زمانے میں جب وہ آوازِ نسواں کی اڈیٹر تھیں۔ اس کے سالنامے کے لئے بہت اصرار سے لکھوایا تھا۔ جسے غالباً ساڑھے تین سال ہو چکے۔ افسانہ سالنامے میں نہیں چھپا۔ دریافت کرنے پر جواب ملا کہ یہ افسانہ وہ اپنے اس مجموعہ میں شامل کریں گی جو وہ تونگے کے نام سے ترتیب دے رہی ہیں۔ اور تین چار مہینے میں ضرور شائع ہو جائے گا۔ اس کے بعد سال ڈیڑھ سال تک تو کتاب کا انتظار کیا۔ کئی خط بھی لکھے۔ آخر کتاب اور جواب سب سے مایوس ہو کر چپ ہو رہی۔ اب افسانے کو اس مجموعے میں شائع کر رہی ہوں۔

آگاہ نہ تپ دروں را بھی رسالہ ادیب میں چھپا تھا۔ نمونہ سفر۔ ہندوستان کے نام سے چمنستان میں شائع ہو چکا ہے۔ تجدید الفت، للی یا سرلا، محبت کے کھیل اور ان مٹ نقش کہیں شائع نہیں ہوئے۔ یہ افسانے چونکہ طویل تھے اس لئے باوجود اکثر کرم فرما حضرات کی فرمائش کے رسالوں میں چھپنے کے نہیں بھیجے لمبے افسانے عام طور پر کئی قسطوں میں شائع کئے جاتے ہیں جس سے ان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔

میرے پہلے مجموعے میں جو نقش اول کے نام سے شائع ہوا ہے بعض افسانے انگریزی سے ماخوذ تھے لیکن یہ افسانے جو اس وقت پیش کئے جا رہے ہیں۔ طبع زاد ہیں اور ان میں سے اکثر کے پلاٹ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔

میں جناب حامد علی خاں صاحب مہتمم مکتبۂ جامعہ کی ممنون ہوں کہ ان کی خاص توجہ سے کتابت اور طباعت کے مرحلے جو اس زمانہ میں ہفت خواں سے کم نہیں طے ہوئے اور خدا خدا کر کے کتاب کے شائع ہونے کی نوبت آئی۔

صالحہ عابد حسین

اپریل سنہ ۱۹۴۶ء

سنبھالا

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنے میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی موہن کمرے کے اندر تھے۔ اس کی بھاوج سرسوتی بے چینی سے برامدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سال کی بچی سوہنی اور سترہ سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے وہ ایک دوسرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے اور مایوسی کے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج وغم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے...... موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوس ناک حادثے سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آ گئے۔ پریم اور سوہنی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سوہنی نے بیقراری سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب بتایئے ممی کو ہوش آیا؟ اب وہ کیسی

ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولئے ڈاکٹر صاحب، ایشور کے لئے کچھ تو کہئے"
پریم نے منہ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے
ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا اور سوہنی
کے سر پہ ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا "گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو"
موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے
کمرے میں لے گئی۔ پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت
کیا اور ڈاکٹر شہاب موہن اور پریم چاروں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے
دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے اس خاموشی کو توڑا۔ اس کی
آواز کانپ رہی تھی ۔

موہن۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی ۔ موہنی بچ جائے گی؟
ڈاکٹر۔ مسٹر موہن آپ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل
بے ہوش ہیں کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں اور انجکشن
سب اب تک بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے
پرتاب ۔ ڈاکٹر کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا ؟
ڈاکٹر۔ پرتاب اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے کہ مسٹر پرتاب
کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے (یکایک پریم کو دیکھ کر) لیکن اگر
انھیں ہوش آ گیا تو دوا ضرور اثر کرے گی ۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کوشش
اٹھا نہ رکھیں گے (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی
ہیں ۔

موہن اور پریم اٹھ کر باہر چلے گئے پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا

پرتاب ۔ کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی ۔

ڈاکٹر ۔ خدا میں بڑی طاقت ہے لیکن میرا علم اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاب نہیں بچیں گی ۔

پرتاب ۔ شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ آپریشن !! کیا آپریشن کرنے سے امید زیست ہو سکتی ہے ۔

ڈاکٹر ۔ آپریشن بالکل فضول ہے۔ وہ پہلے ہی شدید تکلیف اٹھا رہی ہیں میں انھیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا ۔ ان کا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں ۔

پرتاب ۔ افسوس ۔

ڈاکٹر ۔ پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور صرف تم ہو ۔ اگر وہ مر گئیں تو ان کا خون تمھاری گردن پر ہوگا ۔

پرتاب ۔ (ناراضگی سے) شہاب یہ کیا بک رہے ہو ؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں ۔

ڈاکٹر ۔ مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو میں بیس برس سے تمھیں اور انھیں جانتا ہوں ۔ تمھارا دوست ہوں اور تمھارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف ۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا ۔ مسز پرتاب اس وقت شاید سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوں گی ۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت

ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بے مثل حسن تھا اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت۔
لیکن تم نے انھیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انھیں سوسائٹی سے
روشناس کرایا پھر اچھی بری محفل میں زبردستی لے گئے۔ اپنے کم
ظرف اور ذلیل طینت دوستوں تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی
ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انھیں تباہی کے گڑھے کی طرف ڈھکیل
دیا شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی انھیں زبردستی لت لگائی
ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے جس کی وجہ سے ان کی صحت
اور بھی زیادہ خراب ہو گئی اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیرلیں
خود بری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بیجا بندشیں
لگائیں۔ اور ہر طرح ان کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے
وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں اور
تم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمھاری ہی
ڈالی ہوئی تھی آہستہ آہستہ چھڑاتے اس کی پروا کبھی نہ کی بجائے دل
جوئی کے دل آزاری سے کام لیا نتیجہ جو کچھ ہے تمھارے سامنے
ہے شراب کی کثرت اور دلی رنج و غم نے ان کی رہی سہی صحت بھی
برباد کر دی۔ ان کے قویٰ غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ اتنے
سال بھی یہ سب جھیل گئیں دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ
نہ رہ سکتی۔ پرتا بیا موہنی کی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماریوں نے
کر دیا مگر تم خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر شہاب کی لعن طعن سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گذشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر ابھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر موہنی بے سدھ پڑی ہوئی ہے اس کا سرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں۔ گہرے گہرے گڑھے اور سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکئے پر پریشان ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے اب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہوگا۔ اس کی صورت "آثار پدیداست صنادید عجم را" کا عبرت ناک مرقع ہے۔

پریم اور سوہنی ماں کے پلنگ کے پاس صورت تصویر خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ایک طرف سرسوتی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔

ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقت ور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اس کی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے...... ایک منٹ دو...... تین...... چار...... پانچ...... دس...... بیس منٹ گزر گئے کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرہ پر جمی ہیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر کہا مسٹر موہن، مسز ریتا سہا کی نبض اب بہتر حالت میں ہے۔ کچھ دیر میں انھیں ہوش آجائے گا۔" سوہنی اور پریم کے چہرے کھل گئے "سچ ڈاکٹر صاحب" "ہاں امید تو یہی ہے"۔ بیس منٹ اور گزر گئے موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے منھ پر انگلی رکھ کر کمرے کے بیچین لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر ماں کی نظریں جم گئیں لب ہلے بہت خفیف سی جنبش کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا ہے......

ڈاکٹر نے اپنا کان لبوں کو لگا دیا "سوہنی...... پریم...... بلاؤ۔

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبطِ گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے اِدھر اُدھر گر گئے کمزور آواز نکلی۔ میرے بچے۔

دونوں نے اپنے سر ماں کی گود میں رکھ دئے موہنی کی آنکھوں سے دریا بہنے لگا۔ ماں نے اپنا کمزور ہاتھ بڑی کوشش سے اٹھا کر بچوں کے سر پر

رکھا۔ کچھ دیر یونہی گزری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا "پریم.... موہن بھیا کو.... تار دے کر.... بلا دو۔" موہن بے قرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "موہنی موہنی۔ میری پیاری موہنی،..... میں تمہارے پاس موجود ہوں" اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرطِ گریہ سے آواز رک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثارِ زندگی ہویدا ہوئے رک رک کر بولی "بھیا تم آ گئے ہاں اب میں اطمینان سے مروں گی" ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کر لیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا "اب آپ لوگ باہر جائیے ان کو آرام کرنے دیجئے۔ اب بیہوشی نہ ہوگی بلکہ نیند آئے گی" نرس نے پردے گرا دئے موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی کرنل شہاب سے لپٹ گئے "ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب یہی اب اچھی ہو گئیں؟ اب کوئی خطرہ تو باقی نہیں؟ ایشور نے ساری دعائیں سن لیں" خوشی کے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت ٹل گیا" سوہنی نے پریم کا ہاتھ پکڑا "آؤ بھیا پاپا کو فون کر کے خوشخبری سنائیں، دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے پیچھے پیچھے موہنی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہارِ خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا۔

آج موہنی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں سر گندھوایا ہے اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے اس کے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے دو دو منٹ کے لئے اس کے پاس آکر مزاج پرسی کر جاتے ہیں اور وہ مسکرا کر ان سے دو ایک باتیں کرتی ہے سارا گھر خوش وخرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے۔

جب سارے ملنے والے جا چکے تو موہنی نے بھائی کو بلا کر کہا "بھیا میرے دونوں بچوں اور بھابی کو بلا دو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔ موہن نے ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے۔ "ایسا نہ ہو کمزوری ہو جائے" موہنی نے آزردگی سے کہا "کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے" ڈاکٹر شہاب نے کہا "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں اب آپ رو بہ صحت ہیں۔ مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات جمالیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی"۔ موہنی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا "ڈاکٹر صاحب آپ بھی.... مریض کو دھوکا دیتے ہیں۔ مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ میں اچھی ہوں گی یا نہیں۔ یہ صحت نہیں سنبھالا ہے ذرا میری طرف دیکھ کر کہیئے کہ میری حالت اچھی ہونے کی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

موہن نے سوہنی نے پریم اور سرسوتی کو بلایا۔ چند منٹ بعد رباب بھی

کمرے میں داخل ہوا اور موہنی کی مزاج پرسی کی۔ موہنی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی "تم سب میرے قریب آجاؤ تاکہ میری آواز اچھی طرح سن سکو۔ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں رہئیے آپ سے کیا پردہ ہے ہاں سسٹر (نرس) تم کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ" نرس باہر چلی گئی باقی سب لوگ آکر موہنی کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے۔ صرف پرتاب ذرا پرے ہٹ کر آرام کرسی پر گر پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ڈاکٹر نے انار کا عرق موہنی کو پلایا اس نے پی لیا اور پھر آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی ...."جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے شاید تم سمجھ رہے ہو کہ میں کچھ وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت کرنا نہیں ہیں تو تم لوگوں کو اپنی درد بھری مصیبت کی کہانی کے چند ورق سناؤں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی کہ میں بڑی خوش نصیب ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں بال بچے والی ہوں۔ گھر میں روپیہ پیسے کی ریل پیل ہے نام، عزت، دولت غرض کیا چیز تھی جو میرے گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش قسمتی نے اس کے میاں کو معمولی اوورسیر سے ایک لکھ پتی ٹھیکہ دار بنا دیا۔ آخر یہ سب خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے، مگر آہ کسی کو کیا معلوم،، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کی خاطر ایک کم سن شریف لڑکی کی شرافت کا، اس کی عزت کا اسکے ارمانوں اور آرزوؤں، اس کی صحت اور سکون قلب، اس کی راحت اور مسرت..... کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے۔ کاش....... کاش یہ بناوٹی عزت

منحوس دولت نصیب نہ ہوتی ہوتی —— کاش میں ہمیشہ ایک غریب اور سیر کی
بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال
میں قدم رکھا تھا...... بھیا آپ کو تو یاد ہوگا اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟

"چودہ یا پندرہ برس کی"

"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے
کس قدر خوشی اور اطمینان سے گزارے؟ یہ (پرتاپ کی طرف اشارہ کرکے
کرکے) جواب میری صورت سے بیزار ہیں اس وقت پروانہ وار مجھ پر
نثار تھے میری ہر خواہش پوری ہوتی تھی...... میری ہر طرح سے دلجوئی
کی جاتی تھی۔ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا...... آہ میں اس وقت
انھیں ایک فرشتہ خیال کرتی تھی!...... دنیا کا بہترین انسان تصور کرتی
تھی اور دیوتا سمجھتی تھی...... مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے جھوٹی چاندی
بھی نہیں...... لوہے کا ٹکڑا ہے...... ہائے مجھے کیا خبر تھی کہ یہ انسان
کے بھیس میں شیطان ہے"

پریم اور موہنی نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک
دوسرے کو دیکھا۔ سرسوتی نے پرتاپ پر جو شرم سے سر جھکائے بیٹھا تھا قہر
کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے کہا "موہنی
میری پیاری ذرا شانتی سے کام لو" موہنی نے اپنی آنسو بھری آنکھیں بھائی کی
طرف اٹھائیں "بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں جھیل رہی ہوں اور
کبھی کسی سے میں نے اف نہیں کی۔ کون سا الزام انھوں نے مجھ پر نہیں لگایا۔ کیا

کچھ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اٹھائی پر اپنا حال لوگوں پر کھلنے نہ دیا...... خصوصاً اپنے میکے والوں پر کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم مجھے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دنیا کی طرح میرے بھائی بھاوج اور میری اولاد بھی مجھے مجرم گنہگار اور سیاہ کار سمجھیں۔ میں گناہ گار ضرور ہوں، بہت ہوں، مگر اتنی نہیں جتنا دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے" تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔ جب پریم بیٹا تم پیدا ہوئے۔ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی۔ تھوڑے دن بعد پتا جی نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو ان پر بہت مہربان تھا انجینیئر ہو کر اس شہر میں آ یا۔ پتا جی کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکہ داری کی جائے تو انجینیئر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا۔ کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا گیا اور یہاں آ کر کام شروع کر دیا گیا۔ انھوں نے بڑی محنت اور ہوشیاری سے کام کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انھیں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور ہمارے گھر میں دولت کی گنگا بہنے لگی۔ سارا خاندان خوش تھا۔ سب احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بھی بہت خوش تھی۔ — آہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پر عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ ہماری حیثیت بھی بڑھی اور ہم اونچی

سوسائی میں اسے جانے لگے تعلیم یافتہ فیشن ایبل عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ان عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے اول میں ان سے نفرت کرتی تھی مگر جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل محسوس کرتی تھی۔ پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب کے آداب و معاشرت اور "ہائی سوسائٹی کے" ایٹیکیٹ" کی تعلیم دے بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

" ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے کبھی سنیما، کبھی تھیٹر کبھی پک نک اور دعوتیں کبھی بال روم میں جاکر ڈانس دیکھنا، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرا دی تھی۔ جنھوں نے مجھ سے بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہو گئی، ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا۔ ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا۔ پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی۔ اور ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے، دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہو گئی اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی۔ تمام گھر کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جارہی تھی

" کئی سال بعد سوہنی تم پیدا ہوئیں۔ کئی مہینے بیماری کے سبب

مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ در اصل گذشتہ کئی سال ہر وقت اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرزِ عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔ بچی روتی تو خفا ہوتے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں بیوی کا بیڈ روم بھی الگ الگ ہو۔ یہ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا۔ مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ بچوں کے لئے آیائیں اور گورنس رکھ دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کر دو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں ہمارے ایک دوست نے چیف انجینیر سے میرا اور پرتاب کا تعارف کرایا۔ وہ بہت تپاک سے ملے اور مجھے اپنے ہاں مدعو کیا میں جانا نہیں چاہتی تھی مگر پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ۔ بہرحال میں گئی۔ میں اس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی اور ناگوار گزرتی تھی مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے۔ کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو اور انھیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو

کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خود غرض ہے کہ غیر لوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے، اس لئے نہیں کہ ان سے انھیں کوئی عقیدت ہو یا ان کے اخلاق و عادات سے بہت متاثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکنے کے لئے جائز اور ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں خواہ اس کے لئے بیوی کو بد چلن مردوں سے دوستی بھی کیوں نہ کرنی پڑے ....“ موہنی نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ موہن نے تھوڑا سا انگور کا عرق لے کے پلایا اور زانو تکئے ہٹا کر آرام سے لٹا دیا۔

”ان کی دولت روز بروز بڑھتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی برتتے۔ مزاج میں بھی سختی آ گئی تھی۔ صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہار محبت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر آپ تو جانتے ہیں وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں انھوں نے ایک بے تکلف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلائی۔ میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی ...... مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں انھیں اس زمانے میں کسی بہت بڑے ٹھیکے کی فکر تھی اور انھوں نے اپنے خیال میں چیف انجینیر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی اس دن سے ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز اور لاپروا ہوتے گئے میں نے دو ایک مرتبہ شکایت کی تو مجھے سخت سست کہا یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر سخت شرمناک الزام لگایا۔ میں غصے میں آپے سے باہر

ہوگئی اور برس پڑی۔ انھوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی مارنے تک سے دریغ نہیں کیا اس کے بعد سے مجھے ان کی صورت سے دلی نفرت ہوگئی۔ انھوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کردی۔ صرف اس پارٹی اور جلسے میں مجھے جانے کی اجازت تھی جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تفریح اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات کو جاتی تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری نگرانی کے لیے ساتھ ہوتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں میری ذلت کی انتہا ہوچکی تھی۔ دن رات کوفت اور روحانی اذیت نے میری صحت پر برا اثر ڈالا اور اس پر طرہ یہ ہوا۔ مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے......... ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں؟ جب کبھی بچہ ہونے والا ہوتا تو دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اسے ضائع کردیا جاتا۔ اس طرح پانچ مرتبہ ہوا میری صحت اور بھی بدتر ہوگئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط کرنے کو باقاعدہ شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے ہیں اور خود ہی اس منحوس شے کو مجھے زبردستی پلایا کرتے تھے مگر پھر اس پر بھی ملامت اور طعن کرنے لگے میں ضد میں آکر اور زیادہ پیتی۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا تھا کہ اس شخص نے جسے میں اپنا دین، ایمان، اپنی جان، اپنا دیوتا، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری عزت پر، میری وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا شرمناک الزام لگایا۔"

موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جواب تک بالکل خاموش

بیٹھا تھا آگے بڑھا اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں " موہنی ــــــ
آج مجھے سچ سچ بتا دو کیا میں غلطی پر تھا اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی"ــــــ
یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی "

موہن نے بے باکی سے پرتاب کی آنکھوں کا مقابلہ کیا۔ میں آخری وقت
میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی ــــ
تم نے مجھ نا سمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے
روشناس کرایا ــــ میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی بے شک میں
لوگوں سے ہنستی بولتی تھی، مذاق دل لگی کرتی تھی، اس میں بھی شک نہیں کہ جب
لوگ میرے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے تو مجھے سرور سا حاصل ہوتا تھا ــــ
لوگوں کے اشارے کنایوں کے اظہار الفت کو میں قہقہوں میں ٹال دیتی ــــ
میں نے شراب بھی پی ــــ تمہارے مجبور کرنے سے ڈانس بھی کیا ــــ
لیکن پھر بھی...... میں پاک ...... باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولوں گی
چیف انجینیئر مجھ سے اکثر اشاروں کنایوں میں اظہار الفت کرتا تھا مگر میں مذاق
میں اڑاتی رہتی ...... ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہار محبت
...... کیا مگر میں نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی..... اتنی غیرت دلائی..... اس
قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا۔ مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک.....
اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ بیشک
وہ شریف آدمی ہے اور تم....... تم...... نہایت ذلیل........
کم ظرف..... بدباطن..... بدگمان..... جاؤ..... جاؤ ایشور کے لئے یہاں سے

چلے جاؤ..... میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی بے گناہ بیوی پر الزام لگائے........ تمام دنیا میں بدنام کیا میرے بچوں کو مجھ سے جدا کر کے دور دور پڑھنے کو بھیج دیا کہ وہ ماں کی بُری عادتیں سیکھیں گے۔ ان تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا........ چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ....... مجھے تم سے نفرت ہے۔"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا، سوہنی ہچکیوں سے رو رہی تھی موہن کا چہرہ رنج اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو بلایا دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں انجکشن دئے دوائیں منہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹہ بھر بعد موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور سوہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگا لیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "میرے بچو........... تمہاری اماں گنہ گار ہے۔ تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا .... اور...... اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دنیا کی جاہ و منزلت...... عزت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہونا..... ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیش نظر رکھنا۔ سچی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ سچی محبت اور اعتبار سے قناعت اور خدمت خلق سے حاصل ہوتی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی "بھیا میں بہت گنہ گار

ہوں۔ میری دنیا بھی برباد ہوئی اور آخرت بھی خراب ہوئی...... پر تم مجھے بھلانا نہیں...... ایشور سے میرے لئے دعا کرتے رہنا...... اور دیکھنا میرے بچوں کا خیال رکھنا...... یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں۔" موہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان۔ کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار گنتے۔ کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پر ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی ——

اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ بہت نحیف آواز میں کہا "پرتاب پرتاب کو بلاؤ۔ میں آخری دفعہ انھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔" سرسوتی جا کر پرتاب کو بلا لائی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے کمرے میں خوف کا سکوت چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی موہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پرتاب نے جھک کر اپنا ہاتھ موہنی کے ماتھے پر رکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لب ہل رہے تھے۔ پرتاب نے اپنا کان اس کے لبوں سے ملا دیا۔

"میں نے...... معاف کیا...... معاف کر دیا...... مجھے اب بھی...... ہاں ...... اب بھی ان سے...... محبت...... ہے۔ شاید...... ایشور میرے گناہ...... بخش دے...... شاید......" پرتاب لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور بے تاب ہو کر چیخ اٹھا موہنی...... میری مظلوم موہنی...... آہ تم بے قصور ہو۔ تم بے گناہ ہو...... میں نے تم پر شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا...... میں گنہگار ہوں ...... سیاہ کار ہوں...... آہ موہنی تو دیوی ہے ——" موہنی نے

اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھلی ہوئی اس وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی۔ ان میں سے موت جھانک رہی تھی اس نے پرتاب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز منہ سے نکلی " اب میں شانتی سے مروں گی .... ایشور ...... مجھے .... معاف ......"

ڈاکٹر نے ہلکے سے موہنی کی کھلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں جن سے آنسوؤں کے دو قطرے ادھر ادھر ٹپک پڑے۔ پھر ڈاکٹر نے چادر سے موہنی کا منہ ڈھک دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ..... سارا گھر شور و شیون کی آواز سے گونج اٹھا۔

(ادیب)

رقاصہ

"کملا بھابی ۔ چلتی ہو؟ نشاط میں بڑا اچھا کھیل ہو رہا ہے"

"کون سا کھیل ہے"؟

"من کی ہوک کھیل بھی اچھا ہے اور اس کے علاوہ ناچ بھی ہے"

"ناچ کیسا"؟

"آج کل شانتی دیوی جو بڑی مشہور رقاصہ ہے یہاں آئی ہوئی ہے۔ کھیل سے پہلے اس کا ڈانس ہوگا ۔ سُنا ہے بڑا عمدہ رقص کرتی ہے"

"مجھے ناچ سے کوئی دلچسپی نہیں"

"کیوں نہیں؟ تمھیں چلنا پڑے گا"

"مجھ سے یہ شرمناک منظر نہیں دیکھا جاتا کہ میری ایک ہم جنس مردوں کے سامنے بے باکانہ اپنے جسم کی نمائش کرے اور بے شرم مرد اسے گھوریں اور فقرے کسیں اور عورتیں بھی اس کی بے حیائی سے لطف اندوز ہوں اور انھیں اس بات کا افسوس تک نہ ہو کہ ایک عورت کی بے عزتی سب کی بے عزتی ہے نہیں نہیں مجھے نہ لے جاؤ میں نہیں جاؤں گی"

"تم ضرور جاؤ گی بھابی۔ میں تمھیں کھینچ کرلے جاؤں گی۔ بس سارے جہاں کا درد تمھارے جگر ہی میں تو ہے۔"

"بہن۔ رقاصہ کے نام سے میرے دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے۔ کیا میری سرسوتی کی زندگی ایک رقاصہ ہی نے برباد نہیں کی! آہ میری پیاری بہن۔ اس نے بہت برداشت کیا مگر آخر اس ظلم کو زیادہ نہ سہہ سکی اور گھر سے ایسی نکلی کہ آج تک اس کا پتہ نہ ملا۔ ایشور جانے زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

"مگر سنا ہے کہ یہ شانتی دیوی بڑی شریف عورت ہے اس نے رقص کو محض ایک فن کی حیثیت سے سیکھا ہے اور یہ اس کی بھی روادار نہیں کہ مردوں سے بات تک کرے۔ تم کیوں خواہ مخواہ اس سے بدظن ہو۔"

"میں کسی سے بدظن نہیں۔ اور شرافت کی تم نے ایک ہی کہی۔ یہ بے شرمی کچھ کم ہے کہ کوئی عورت ہزاروں مردوں کے سامنے یوں اپنے جسم کی نمائش کرے؟ میں کہہ چکی ہوں کہ مجھ سے عورتوں کی یہ کھلی ہوئی توہین نہیں دیکھی جاتی۔"

"ہٹو بھی بھلا اس میں سب عورتوں کی توہین کیوں ہونے لگی جو کرے گی اس کی ہو یا نہ ہو۔ اور خیر کچھ بھی ہو آج تو تمھیں میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔"

"میں لے جاؤں گی کملا بھابی۔ تم جانتی ہو کہ مجھ سے ضد میں نہیں جیت سکتیں پھر کیوں انکار کرتی ہو۔"

"تم نے میرا ناک میں دم کر دیا"
"اچھا یونہی سہی۔ مگر چلنا ضرور پڑے گا"
"دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو میری جان چھوڑ دو"

نشاط کا عظیم الشان ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جائے پانچ روپے سے چار آنے والے درجہ تک کہیں ایک سیٹ بھی خالی نہیں چونی والوں میں مار پیٹ گالی گلوج اور دھول دھپا ہو رہا ہے۔ بڑے درجوں والے بھی بے چینی اور بے صبری سے پہلو بدل بدل کر آپس میں تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ آج یہاں شانتی دیوی کا ناچ ہے۔

ہال روشنی سے جگمگا رہا ہے۔ سینما کے پردے کے سامنے ایک خوبصورت اسٹیج بنایا گیا ہے جس کی آرائش پھولوں اور رنگ برنگے بجلی کے قمقموں سے کی گئی ہے، اس کے سامنے کی طرف ایک کوچ پر بہت سے سازندے وغیرہ بیٹھے ہیں۔

یکایک اسٹیج کے آس پاس کے سینکڑوں رنگ برنگے بلب روشن ہو گئے اور اس روشنی میں لوگوں نے ایک اپسرا کی طرح شانتی دیوی کو کھڑے دیکھا۔ شور و غل ایک دم بند ہو گیا اور ہزاروں آنکھیں اس کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ سبز رنگ اور سنہرے کام کی ساڑھی اور لیف آستین کا سنہری بلاؤز پہنے تھی۔ اس کا قد لمبا، جسم چھریرا اور ناک نقشہ بہت موزوں تھا۔ "میک اپ" کی وجہ سے اگرچہ اس کا چہرہ سرخ و سفید نظر آ رہا تھا مگر اس

کی عریاں باہیں صندلی رنگ کی تھیں۔ دو لمبی لمبی چوٹیاں ناگن کی طرح سینے پر پڑی بل کھا رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور لمبی سیاہ پلکیں سرخ رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ پتلی سی مانگ سیاہ بالوں میں بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ اور وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے حاضرین کو سر جھکاتے نمسکار کر رہی تھی۔

ایک بڈھے سے آدمی نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا "یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ شریمتی شانتی دیوی صاحبہ نے ہماری دعوت قبول فرمائی اور یہاں آکر اپنے رقص کے کمالات دکھانے پر تیار ہو گئیں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی باکمال رقاصہ ہیں۔ اب وہ آپ کو اپنے جاں فزا رقص سے محظوظ فرمائیں گی۔" یہ کہہ کر اس نے گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا سا ہار رقاصہ کے گلے میں ڈال دیا۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا رقاصہ نے ایک بار پھر سر جھکا کر پرنام کیا۔ سازندوں نے اپنے ساز سنبھالے، رقاصہ کے جسم کو حرکت ہوئی اور ناچ شروع ہو گیا۔

ایک طرف دو نوجوان پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ سگرٹ ان کے ہاتھ میں تھے مگر وہ ان کو پینا بھول گئے تھے اور محویت کی حالت میں رقص اور رقاصہ کی دید میں مشغول تھے۔ ایک نے دوسرے سے آہستہ سے کہا "سروپ یہ رقاصہ اس قدر شرمیلی کیوں ہے۔ نظریں ہی نہیں اٹھاتی۔" دوسرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "تم تو دیکھنے میں اس قدر محو ہو کہ مجھے ڈر ہے کہ .... کیا

"آنند خدا کے لئے چپ رہو میں اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہوں"
"مجھے کیا خبر تھی کہ آپ اسے دیکھتے ہی یوں لٹو ہو جائیں گے ورنہ آپ کو ہرگز نہ لاتا۔"
"ذرا غور سے دیکھو اس کی صورت کس سے ملتی ہے۔"
"کس سے ملتی ہے؟ تمہاری اس پرانی محبوبہ راما بائی سے تو بالکل نہیں ملتی۔"
"راما بائی سے نہیں اس کی صورت تو کسی اور ہی سے ملتی ہے۔ آنند غور سے دیکھو کیا اس میں سرسوتی کی مشابہت نہیں۔"
"ہاں واقعی اس میں اور بھابی میں غضب کی مشابہت ہے۔"
عین اس وقت رقاصہ نے غیر ارادی طور پر نظر اٹھائی۔ سروپ کی اور اس کی آنکھیں چار ہوئیں اور سروپ نے بدحواس ہو کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ رقاصہ کے پاؤں لڑکھڑائے، ہاتھ کانپے اور ایک لمحے کے لئے وہ ناچنا بھول گئی۔ مگر اس نے جلدی ہی اپنے پر قابو پالیا اور دوبارہ ناچنے لگی۔ چند منٹ بعد زنانہ درجہ سے ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی۔ لوگ اُدھر دیکھنے لگے، رقاصہ نے بھی نظریں اٹھائیں اور خدا جانے کیا نظر آیا کہ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑ لیا اور جلدی سے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔
لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا؟ مگر کسی کو معلوم نہ تھا۔ لوگوں نے دوبارہ شانتی دیوی کا ناچ دیکھنے کی خواہش کا اظہار

کیا مگر منیجر نے آکر معذرت کی کہ شانتی دیوی کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے اور اب وہ رقص نہیں کر سکتیں۔ سب روشنیاں گل ہوگئیں کھیل شروع ہو گیا۔

پشت کے کمرے میں رقاصہ ایک آرام کرسی پر پڑی تھی اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا اور اس کا نازک جسم جوشِ رقت سے کانپ رہا تھا۔ کملا کو اس کی نند سنبھالے ہوئے کمرے میں آئی اور وہ دونوں اس منظر کو دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ رقاصہ نے آہٹ سن کر آنے والی کی طرف دیکھا، وہ دونوں ہاتھ پھیلائے اور دوسرے لمحے دونوں بہنیں گلے لپٹی رو رہی تھیں۔ کملا نے روتے روتے کہا "ہائے سرسوتی۔ میں یہ کیا دیکھ رہی ہوں۔ میری پیاری بہن تو اس حال میں...... اس زندگی میں؟"

"ہاں تمہاری بدنصیب سرسوتی اب رقاصہ ہے ایک ذلیل وحقیر مخلوق"۔

"اری تجھے اپنی باپ کی عزت کا بھی پاس نہ ہوا" تجھے پتی کی آبرو کا بھی خیال نہ آیا، ہائے بہن تو نے یہ کیا کیا؟"

رقاصہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ تھا "پتی!! پتی! جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس کا نام میرے سامنے لیتی ہو؟ اس بے شرم بے حیا کا؟ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا کہ وہ بھی کوئی عزت اور آبرو رکھتا ہے؟ جب اس نے ایک طوائف سے کھلے بندوں محبت کی اس وقت اس کی عزت کہاں سوئی ہوئی تھی؟ اس نے

ایک آوارہ عورت کو میرے سینے پر مونگ دلنے کے لئے لا بٹھایا۔ دن رات میرے منہ پر، مجھے سنا کر، اس کی تعریفیں کرتا۔ اس کے کمالاتِ رقص کو سراہتا اور مجھے جاہل، گنوار، بدتمیز اور بے وقوف کہتا۔ جب اس نے ہر طرح میری بے عزتی کی اس وقت کسی نے نہ کہا کہ بیوی کی بھی کوئی عزت اور اس میں بھی کچھ خودداری ہوتی ہے اس کی ان حرکتوں سے میری عزت کو دھبہ نہیں لگتا تھا؟ اور اب تم مجھے شرم دلانے آئی ہو! غصے میں اس اس کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

کملا نے کہا" یہ سب بھی مگر عزت ایسی چیز نہیں جسے انتقام کے لئے گنوا دیا جائے کاش تو مر گئی ہوتی جیسا کہ ہم سب سمجھتے تھے۔"

" ہاں مر گئی ہوتی تو بہت اچھا تھا۔ مگر بدنصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی۔ اگر سروپ میری بے عزتی نہ کرتا، اگر وہ دن رات میرے سامنے اور میرے مقابلے میں اس ذلیل رقاصہ کی تعریفیں نہ کرتا اور مجھے ہر طرح ذلیل کر کے شرمندہ نہ کرتا تو میں ہرگز اس پیشے کو اختیار نہ کرتی ——— مگر اس نے ——— اس بے وفا اور بے شرم شخص نے مجھے اس کام پر مجبور کیا۔۔۔۔۔ میں بہت خوش ہوں کہ وہ ہال میں موجود تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے کرتوتوں کا انجام دیکھ لیا ——— اب تو وہ خوش ہوگا کہ میں بھی بہت اچھی رقاصہ بن گئی ہوں؟"

اسی وقت سروپ اور آنند کمرے میں داخل ہوئے۔ رقاصہ نے مڑ کر اُدھر دیکھا، چند لمحے بت کی طرح ساکت کھڑی رہی، اس کا بند بند کانپ

رہا تھا محبت کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی ۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا " سروپ .... آہ .... میرے پتی .... میرے پیارے سروپ " اور بے ہوش ہوکر سروپ کے پاؤں کے پاس گر پڑی ۔

سروپ نے سرسوتی کے پاؤں اپنی گود میں رکھ لئے اور ان پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا ۔ کملا نے دونوں باہیں بہن کے گلے میں ڈال دیں اور منہ پر منہ رکھ کر آنسو بہانے لگی ..... آنند، نیبھر، کملا کی نند اور کئی دوسرے آدمی کھڑے یہ دردناک منظر دیکھ رہے تھے اور کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ میں آنسو نہ ہوں ۔

(ساقی)

یہ ہندوستان!

عابدہ کھاتے پیتے باپ کی بیٹی تھی۔ اگرچہ ماں بچپن ہی سے داغ مفارقت دے گئی تھی مگر باپ نے مقدور بھر بہت لاڈ و پیار سے پالا اور ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ جوان ہوئی تو خوب صورت نکلی، کتنے رشتے کے پیاموں کی بھرمار ہوگئی۔ باپ کو خود ہی فکر تھی کہ جوان لڑکی بے ماں کے گھر میں اکیلی کس طرح رہے گی کوئی جھوٹ موٹ بھی کچھ کہہ دے گا تو منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ آخر سوچ سمجھ کر عابدہ کے خالہ کے لڑکے کو منتخب کیا۔ سو روپے مہینے کا نوکر، شریف اور خوبصورت اور عابدہ کا دلدادہ نوجوان تھا۔ باپ نے صلاح مشورہ کر عقد کر دیا۔ رخصتی چھ مہینے بعد قرار پائی۔ عابدہ بہت خوش تھی۔ اسلم اور وہ ساتھ پلے بڑھے اور ساتھ کے کھیلے تھے۔ دونوں میں بچپن سے بہت انس تھا۔ باپ بیٹی کے جہیز کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ ایک دن خبر آئی اسلم کی کسی موٹر سے ٹکر ہوگئی جس سے سخت مجروح ہوا ہے۔ بچارے باپ نے اس خبر کو بیٹی سے چھپایا اور خود جانے کو تیار ہوا کہ گھنٹہ بھر بعد دوسرا تار آگیا۔ اسلم ناشاد و نامراد چل بسا۔ غریب پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سولہ سترہ برس

کی کنواری بچی بیاہ سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی باپ بیٹی کے صدمہ کا کیا پوچھنا جب کہ اپنے اور غیر، دوست اور دشمن، کھڑا اور بیٹھا ہر کوئی افسوس کر رہا تھا۔ اسلم کی بیوہ ماں پر قیامت کا وقت تھا بہو کو گلے لگا لگا کر پچھاڑیں کھاتی تھی، سر پھوڑتی تھی بال نوچتی تھی مگر موت اس کے بس کی نہ تھی کہ جان دے دیتی..... عابدہ پتھر کی مورتی بنی سکتے کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔ ایک ایک کا منہ دیکھتی اور گھبرا گھبرا کر اٹھ کر بھاگتی۔ باپ نے آکر بیٹی کو گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ عابدہ جو اب تک خاموش تھی باپ کو دیکھ کر پھٹ پڑی اور پھر تو باپ بیٹی لپٹ کر ایسا ایسا پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں کہ دیکھنے والوں کے کلیجے پھٹتے تھے۔

عابدہ کی بیوگی کو چار سال گزر گئے۔ اب وہ شباب کی سب سے دلکش منزل سے گزر رہی تھی۔ اس کی مخمور آنکھیں، گداز جسم، دلربا صورت اور مہنس کی سی چال خواہ مخواہ ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ پر اس کے سفید لباس، اداس نظروں اور بجھی ہوئی طبیعت نے اس کی جوانی کو جیسے دبا سا دیا تھا۔ اسے قدم قدم، بات بات پر اپنی بدنصیبی اور بدبختی کی یاد دلائی جاتی تھی، ہمجولیاں، سہیلیاں، بہنیں اور پڑوسنیں رنگ برنگے کپڑے اور خوبصورت زیور پہنتیں اور نت نئے سنگار کرتیں اور عابدہ حسرت سے دیکھ کر رہ جاتی وہ اپنے شوہروں کی محبت کے دلکش اور رنگین افسانے سناتیں اور عابدہ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے پی لیتی۔ وہ اپنے

بچوں کو فخر و ناز کے جذبات کے ساتھ عابدہ کو دکھاتیں اور اس کا دل جیسے
اندر سے مسوس اٹھتا اور وہ بچوں کو بے تحاشا چومنے لگتی۔ اگر کبھی بھولے
بسرے وہ ہمجولیوں میں بیٹھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تو بڑی بوڑھیوں کی تیز نظریں
فوراً اسے یاد دلاتیں کہ وہ بدنصیب بیوہ ہے جسے ہنسنے کا بھی حق حاصل نہیں۔
باپ کی فکر مند صورت اور پریشان نظریں اسی کے دل پر تیر کی طرح لگتیں۔
باپ کی وجہ سے سچ مچ اس نے اپنے دل کو مار لیا تھا اور ہر طرح اس کی
کوشش کرتی کہ ان کے دل سے اس فکر کو دور کر دے کہ جوان لڑکی بے سہارے
کس طرح دنیا میں رہ سکے گی۔ مگر یہ صدمہ ایسا نہ تھا جو ان کے دل سے دور
ہو سکتا۔ وہ گھل گھل کر سچ مچ بیمار پڑ گئے اور پھر تو ان کی فکر کی کوئی حد ہی نہ
رہی۔ اپنے بعض سمجھ دار دوستوں سے مشورہ لیا تو سب نے یہی رائے دی کہ
دوسرا عقد کر دو۔ لیکن جب گھر میں یہ بات منہ سے نکالی تو عورتوں نے قیامت
مچا دی "ہے ہے نوج خدا نہ کرے"۔ "یہ تو نصیب کی بات ہے نصیب
کی کھوٹی نہ ہوتی تو وہ کڑیل جوان کیوں جان سے جاتا"۔ "شریفوں میں یہ
نہیں ہوتا"۔ "جس نے ایک کو کھایا وہ دوسرے کو بھی کھائے گی نحوست
کبھی جاتی نہیں"۔

عابدہ عورتوں کی یہ سب باتیں سنتی اور اندر ہی اندر گھلتی مگر منہ سے
کچھ کہنے کی مجال نہ تھی لیکن باپ مستقل مزاج آدمی تھے۔ جو ٹھانی سو ٹھانی۔
لوگوں کی باتیں سنتے اور خاموش رہتے یا یہ کہہ کر منہ بند کر دیتے "خالی عقد
ہی تو ہوا تھا۔ کون سا بیاہ ہو گیا تھا جو اسے رانڈ کہا جائے۔ اور میں تو اگر

رخصتی ہو چکی ہوتی تب بھی کر دیتا۔ خدا رسول کے بتاتے ہوئے حکم کی تعمیل
کر رہا ہوں کوئی گناہ نہیں کر رہا۔ جوان لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر
مر گیا تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" اب لوگ ان کے سامنے تو کچھ نہ کہتے
مگر عابدہ کو ایسی ایسی باتیں سننی پڑتیں کہ بس اسی کا دل تھا جو انھیں برداشت
کرتی تھی، کچھ ایسی ضابطہ اور صابر لڑکی تھی کہ سب کچھ سنتی مگر نہ تیوری پر
بل ڈالتی نہ منہ سے اُف کرتی۔

اب عابدہ کے باپ اس فکر میں پریشان تھے کہ بر کہاں سے ڈھونڈیں بیا
بیوہ سے کون بیاہ کرے۔ کنواروں کی تو بات ہی کیا ہے رنڈوے بھی یہ
چاہتے ہیں کہ کنواری کم عمر لڑکی سے بیاہ رچائیں۔ عابدہ لاکھ کنواری سہی
مگر رنڈاپے کے نام کا داغ تو لگ ہی چکا تھا۔ باپ چاہتے تھے کسی کھاتے پیتے
پڑھے لکھے مناسب عمر کے لڑکے سے بیاہیں مگر ایسا بر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر
ایک پیام مجبوراً منظور کرنا پڑا۔ چالیس بیالیس کی عمر۔ پہلی بیوی فوت ہو چکی
تھی اور پچیس تیس روپے کا دہلی میں نوکر تھا۔ نام تھا حمید۔ دل تو نہ ٹھکتا
تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر منظوری دے دی۔ ایک دن حمید دو چار یار
دوستوں کے ساتھ آیا اور نکاح ہو گیا۔ باپ نے بادل پر درد بیٹی کو رخصت
کیا۔ عابدہ کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھی۔ دل غم سے پھٹا جاتا تھا۔
باپ نے رخصت کے وقت بڑی دیر تک بیٹی کو سمجھایا کہ دیکھو جو ہو چکا اس
کا کبھی خیال بھی نہ کرنا —— اب تمھاری دنیا تمھارا شوہر ہے۔ اس کی قلیل
آمدنی کو بڑی دولت سمجھنا۔ میں چراغِ سحری ہوں میرا کیا بھروسہ ہے ہاں

جب تک زندہ رہوں تمہیں تکلیف نہ ہونے دوں گا۔

عابدہ سسرال پہنچی تو ایک دوسری دنیا دیکھی۔ چھوٹا سا کچا گھر جس میں متعدد مرد عورتیں اور بچے بھرے ہوئے تھے، موٹی سی بدمزاج ساس اور بڈھا بیمار سسر، تیز مزاج نندیں اور بدتمیز دیور۔ اس کا استقبال تانے تشنوں اور بولیوں ٹھولیوں سے کیا گیا۔ بھن پیری اور منحوس کا خطاب تو ساڑھے چار برس پہلے ہی مل چکا تھا۔

سال بھر عابدہ نے جس طرح سسرال میں گزارا وہ بس اس کا دل ہی جانتا ہے ہر قسم کی خدمت اور اطاعت کرنے کے باوجود وہ جاہل سسرال والوں کو خوش نہ کر سکی کیونکہ وہ بیوہ تھی اور ان کے نزدیک منحوس اور اچھوت۔ اس کا قصور یہ تھا کہ حمید نے اس سے کیوں شادی کی عابدہ اکثر سوچتی کہ یا اللہ اگر اسلم لاری سے ٹکرا کر مر گیا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ابا نے میرا دوسرا نکاح کرنا چاہا تو کہنے والوں کی دلدوز باتوں کا نشانہ میں کیوں بنی؟ حمید نے مجھ سے شادی کر لی تو اس کے بدلے قصور وار مجھے کیوں سمجھا جاتا ہے......... اس کا دل ان سب سوالات کا جواب صرف یہی دیتا تھا کہ تو عورت ہے۔ ہندوستان کی بدنصیب عورت.......... رسم و رواج کی لونڈی، سماج کی کنیز......... مرد کی باندی اور اس لئے.............. ناکردہ گناہ بھی ملزم ہو اور مصیبت برداشت کرنے کی سزاوار۔

ہاں جب حمید چند دن کی چھٹی پر گھر آتا تو عابدہ کی دنیا بدل جاتی۔ حمید ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور صورت بھی اچھی نہ تھی۔ اس پر طرہ جاہل اور غریب بھی تھا، مگر نیک طبیعت اور شریف تھا اور پہلو میں محبت بھرا دل رکھتا تھا۔ عابدہ شروع میں محض فرض سمجھ کر اس کی عزت اور خدمت کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ حمید کی شرافت اور سچی محبت نے اس کے دل میں گھر کر لیا۔ اس نے کوشش کر کے خوبصورت نوجوان اور مہذب اسلم کے دلکش خیال کو دل سے دور کر دیا اور بڑی مشکل اور کش مکش کے بعد حمید کی مورتی کو اس کی جگہ دے دی۔ حمید جب گھر آتا تو گھر والوں کا بدترین برتاؤ عابدہ کے ساتھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا مگر اپنی قلیل آمدنی میں دلی جیسی جگہ لے جا کر رکھنے کی اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اس مرتبہ وہ آیا تو دیکھا کہ عابدہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ بچہ ہونے والا ہے اور اسے تمام دن سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر نہ اس کے جسم کو آرام ہے نہ دل کو سکون۔ اس نے ماں کو اس طرف توجہ دلائی تو وہ الٹی بیٹے پر برس پڑی......... غرض ماں بیٹے میں خوب لڑائی ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ حمید بیوی کو لے کر دہلی چلا آیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک چھوٹا سا مکان پہاڑ گنج میں چار روپے کرایہ پر ملا۔ عابدہ نے خوش خوش خندہ پیشانی کے ساتھ گھر کو ٹھیک ٹھاک کیا اور کسی طرح اس نے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس قید خانے میں اس کا کس قدر دم گھٹتا ہے۔ اسے یہ قید خانہ دوسروں کے محلوں سے زیادہ اچھا اور دل کش معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ اس کا

اپنا گھر تھا جہاں اس کی حکومت تھی، وہ جو چاہے کرے کوئی طعن کرنے والا، برا بھلا کہنے والا نہیں تھا۔ حمید ہر وقت اس کی دلجوئی کرتا۔ تیس روپے مہینے کے مہینے اس کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا اور پھر الٹ کر یہ نہ پوچھتا کہ تم نے کیا کئے۔

عابدہ سلیقے اور کفایت سے اسی میں گھر کا خرچ چلاتی۔ باپ جو روپیہ کبھی کبھار بھیج دیتے تھے اس میں اپنا اور میاں کا کپڑا جوتی اور گھر کا چھوٹا موٹا سامان بناتی رہتی تھی اور تھوڑا بہت وقت بے وقت کے لئے پس انداز بھی کرتی جاتی۔ دلی آنے کے چھ مہینے بعد عابدہ کے بچی پیدا ہوئی۔ حمید نے اپنے رشتے کی بڈھی پھوپی کو بلایا تھا جو بیس دن بعد نہلا کر واپس چلی گئی۔ ساس تو لڑکی کا نام سن کر اور بھی زیادہ جل گئی مگر حمید بہت خوش تھا اور عابدہ کے باپ تو خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

اسی طرح تین سال اور گزر گئے اور اس عرصے میں عابدہ کے ایک لڑکا اور ہوا ــــ وہ خاصی کمزور ہوگئی تھی مگر پھر بھی بچوں کو پرورش اور گھر کے کام کاج کا خاص خیال رکھتی۔ اور حمید کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتی۔ بچوں کے بڑھنے سے خرچ بڑھا اور باپ کے مرنے سے جو سہارا وہ لگاتے تھے وہ بھی جاتا رہا۔ اس لئے بہت مشکل سے وہ خرچ پورا کرتی۔ لیکن پاس پڑوس کی ملنے جلنے والیوں پر اس نے کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ حیثیت میں ان سے کم یا رتبہ میں ان سے گھٹیا ہے اور نہ کبھی اشد سے اشد ضرورت کے وقت بھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ وہ ان پچیس[۲] تیس روپوں میں اس سلیقے سے گزر کرتی کہ دیکھنے والے حمید کو پچاس

ساٹھ سے کم آمدنی والا نہیں سمجھتے تھے۔

"حامد کی ماں، حامد کی ماں آج ایک نئی خبر سنی ہے" حمید نے باہر سے آتے ہی کہا۔ عابدہ بچے کو گود میں لئے سلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ برابر مچلے جاتا تھا" خبر کو چھوڑو، اسے دیکھو کیا ہوا ہے۔ گھنٹہ بھر سے رو رو کر سر پر گھر اٹھا رکھا ہے"۔

"ہوتا کیا گرمی ہے پنکھا جھلو یا نہلا دو ابھی چپ ہو جائے گا۔ ہاں وہ خبر تو تم نے سُنی ہی نہیں۔ لڑائی شروع ہو گئی"۔

"کیسی لڑائی کس سے لڑ آئے"۔

"میں کیوں کسی سے لڑتا۔ جرمنی انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔ پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ آج ہر طرف لوگ اسی کی باتیں کر رہے ہیں"۔

"چلو ہمیں کیا جو لڑیں وہ جانیں"۔

"تمھیں اس کی ذرا سی بھی پروا نہیں؟ ارے بی لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی کا چھڑنا ہندوستان کے لئے بہت مفید ہو گا۔ ہمارا ملک آزاد ہو جائے گا بہت سی نوکریاں نکلیں گی۔ بیکاروں کو کام ملے گا، بہت سے نئے کارخانے قائم ہوں گے، مزدوروں کی مزدوری بڑھ جائے گی، کسان خوش حال ہو جائیں گے"۔

"ہاں ہاں سن لیا۔ مگر یہ بھی سوچا کہ قحط پڑے گا۔ ہر چیز مہنگی ہو جائے گی پچھلی لڑائی کی مہنگی کا حال سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں خدا نہ

کرے کہ وہ حال پھر ہو۔ اور بھرتی ہو گی۔ ہزاروں مائیں اپنے لاڈلوں کی صورت کو ترسیں گی۔ ہزاروں بیویاں رانڈ ہو جائیں گی بہنیں بھائیوں کی صورت دیکھنے کو تڑپا کریں گی۔ ہزاروں بچے یتیم ہو جائیں گے۔ لاکھوں آدمی مارے جائیں گے اس کو بھی سوچا؟

"اری بی موت زندگی سب اللہ کے اختیار ہے کیا بغیر لڑائی کے لوگ نہیں مرتے؟ بھوکے مرنے سے پیٹ بھر کر مرنا ہزار درجہ بہتر ہے کہو تو میں بھی بھرتی ہو جاؤں۔ اچھی تنخواہ ملے گی۔"

"خدا کے لئے تم مجھ سے ایسی الٹی پلٹی باتیں نہ کیا کرو۔"

"آخر حرج ہی کیا ہے۔"

"بھئی رحم کرو میرے حال پر مجھے وہم آتا ہے آج سے کہا تو کہا آئندہ اس بات کو منہ سے نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔"

"میں تو تمھیں چھیڑ رہا تھا کہ دیکھوں تم مجھے کتنا چاہتی ہو۔ ورنہ تمھیں اور بچوں کو چھوڑ کر تو میں جنت میں بھی نہ جاؤں۔"

عابدہ نے دزدیدہ نظروں سے حمید کی طرف دیکھا جن میں پاکیزہ محبت کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور آنکھیں جھکا لیں۔

"ساجدہ کے ابا تم تو کہتے تھے لڑائی سال بھر میں ختم ہو جائے گی اب تو دو سال سے بھی زیادہ ہو گئے کسی طرح کمبخت ختم ہونے میں نہیں آتی۔"

مجھے کیا خبر جو لوگوں سے سنتا ہوں وہ کہہ دیتا ہوں مجھے تو روز
بروز یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ گزارا کیسے ہو غضب خدا کا چھ سیر کا گیہوں آٹھ
چھٹانک کا گھی، تیل تک کے دام کتنے چڑھ گئے۔ گوشت ترکاری سب کے
دام دگنے ہو گئے اور تنخواہ وہی تیس کی تیس۔"

"میں تو تمھارے مارے منہ سے بھاپ نہیں نکالتی مگر ہر چیز کی اس قدر
دقّت ہے کہ کیا بتاؤں نہ جانے کس طرح پوری ڈالتی ہوں ساجدہ اور
حامد دونوں کے پاس کپڑے نہیں رہے کل پھیری والے کو بٹھایا تھا کپڑے
کے دام بھی تو دگنے ہو گئے اور سنا ہے ابھی اور بڑھیں گے ——
حامد اور ساجدہ کے دو دو جوڑوں کا کپڑا لے کر بالکل خالی ہاتھ ہو گئی
جی چاہتا تھا تمھارے کوٹ کا کپڑا لے لوں، مگر کیا کرتی دل مسوس
کر رہ گئی ...."

حامد کی ماں کہو تو پانچ سات مرغیاں لے لیں۔ انڈے ایک آنے
پانچ پیسے بک رہے ہیں۔ کچھ تو سہارا لگے گا۔"

"مگر دنیا کیا کہے گی۔ کیسی شرم کی بات ہے کہ ہم انڈے بیچیں۔"

"اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کاروبار کرنا عیب نہیں، گناہ نہیں
اگر ان باتوں کا خیال کرو گی تو گزر کیسے ہو گی یہ سوچ لو۔"

"اچھا جو تمھاری مرضی ـــــــ لے آنا مرغیاں مگر پہلے ٹاپے کا
انتظام کر لینا۔"

عابدہ کی صحت روز بروز گرتی جاتی تھی۔ تھا تو پانچواں مہینہ مگر پیٹ اس قدر بڑھ گیا تھا جیسے آٹھواں یا نواں مہینہ لگ چکا ہو۔ چلنا پھرنا، کام کاج کرنا ابھی سے دوبھر ہو گیا تھا۔ بچی اب چھ سات برس کی تھی۔ چھوٹا موٹا کام وہ کر دیتی۔ حمید کام پر سے آتا تو وہ بھی ہاتھ بٹاتا۔ پھر بھی نہ نہ کرکے بہت کچھ کرنا پڑتا تھا۔ اوپر سے ہر وقت کی فکر کہ خرچ کیسے پورا ہو۔ چار سیر کا گیہوں اور پانچ سیر کا جوار باجرہ۔ پھر مصیبت یہ کہ روپے لئے پھرے جاؤ بازار میں سے اناج عنقا ہو گیا۔ کبھی کبھی تو بچوں کو بھوکا ہی سلانا پڑتا تھا۔ مٹی کا تیل الگ نایاب۔ مجبور ہو کر کڑوے تیل کا چراغ جلانا شروع کیا۔ کئی مہینے سے عابدہ محلہ پڑوس کے سلائی کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ چراغ کی مدھم روشنی میں بڑی مشکل سے کام ہوتا۔ جاڑا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گھر میں کسی کے پاس بھی موٹے کپڑے نہ تھے اور نہ پوری طرح لحاف بچھونے۔ ہر وقت وہ اسی ادھیڑ بن میں رہتی کہ یا اللہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

حمید لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔ عابدہ اسے دیکھتے ہی بولی "حامد کے ابا صبح سے ساجدہ کا برا حال ہے۔ بڑی سخت پیچش ہے کل ہے کو کبھی کمبخت باجرے کا آٹا کھایا تھا۔ یہ منحوس جنگ جو نہ کرے تھوڑا ہے"۔ حمید نے مرے ہوئے لہجے میں کہا "گھبراتی کیوں ہو۔ ذرا سا اسپغول کھلا دو ٹھیک ہو جائے گی"۔

اسپغول تو کئی مرتبہ کھلا چکی کچھ بھی فرق نہیں پڑا ــــ رات سے فاقے سے ہے ذرا سے چاول اور مونگ کی دال لادو تو کھچڑی ہی پکا

دو دل" یہ کہہ کر اس نے دو آنے حمید کے ہاتھ پر رکھے۔ وہ الٹے قدموں واپس گیا اور پورے گھنٹہ بھر بعد واپس آیا اور ایک ذرا سی پوٹلی عابدہ کے ہاتھ میں دے دی۔ "دو گھنٹے تک دوکانداروں کی خوشامد کرتا رہا۔ تب جا کر یہ مٹھی بھر دال چاول دیئے ہیں ہر کوئی دھتکار دیتا ہے کہ جاؤ جاؤ وہ زمانہ گیا جب چار چار پیسے کے سودے ملا کرتے تھے۔ (دل گیر آواز سے) کمبخت بڑا ذلیل کرتے ہیں"۔ عابدہ نے کھچڑی لے کر بھگو دی اور دلجوئی کے انداز سے بولی "تم جی برا نہ کرو۔ اب کی تنخواہ پر ایک روپیہ کے چاول منگا کر رکھ لوں گی۔ بچوں کا گھر ہے ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے" حمید سر پکڑے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ شکستہ لہجے میں بولا "حامد کی ماں .... کیا کہوں .... کیسے کہوں ..... تمہارا سن کر کیا حال ہوگا" عابدہ گھبرا گئی "ہے ہے کیا ہوا؟ کچھ کہو تو میرا دل بولایا جاتا ہے"۔ حمید نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا "نوکری چھوٹ گئی"۔ عابدہ کو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی بڑا سا پتھر کسی نے اس کے دل پر کھینچ کر مار دیا ہے۔

"کیا کہا؟ نوکری چھوٹ گئی؟ کیوں؟ کیسے؟ آخر ہوا کیا؟ حمید سر پکڑے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ عابدہ جھلا گئی "بتاتے کیوں نہیں، ضرور کسی سے لڑے ہوں گے روز بروز تمہارا مزاج خراب ہوتا جاتا ہے" عابدہ غصے اور پریشانی سے پاگل سی ہوتی جا رہی تھی ڈرتے ڈرتے حمید نے اسے بتایا کہ افسر نے مجھے گالیاں دیں جس پر مجھے بھی غصہ آگیا اور

ایک سخت جواب دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مجھے برخواست کر دیا۔ اور
پچیس دن کی تنخواہ کے پچیس روپے ہاتھ پر رکھ دیئے۔
کئی دن تک عابدہ کو بہت غصہ رہا حمید حیران رہا کہ عابدہ جیسی
کم سخن اور حلیم مزاج عورت کو کیا ہو گیا ہے وہ اس سے بات کرتے ڈرتا
بچے ماں کے پاس جاتے کانپتے کہ کہیں پیٹ نہ دے۔ عابدہ دن رات
منہ لپیٹے پڑی روتی رہتی۔ آخر تین چار دن بعد اس نے خود ہی اپنی
طبیعت کو سنبھالا اور اپنے پر نظر کی اُن پر ناراض ہونا بالکل بے جا
ہے۔ قصور ہے تو اس فرعون بے سامان افسر کا جس نے انھیں گالیاں
دیں اگر وہ گالیاں سن کر بھی اس کی خوشامد کرتے تو میں خود ہی انھیں
بے غیرت اور بے حمیت سمجھتی۔ میرا فرض ہے کہ اس وقت ان کو تسلی
دوں اور ہمت بندھاؤں نہ کہ اور زیادہ انھیں پریشان کروں جس نے
منہ دیا وہ کھانے کو بھی دے گا۔ ایک در بند سو در کھلے" اس طرح
دل کو سمجھا بجھا کر اس نے اپنی طبیعت کو قابو میں کیا۔ میاں سے معافی
مانگی تسلی تشفی دی اور بہت دیر کی بات چیت اور بحث مباحثہ کے بعد
یہ طے پایا کہ دہلی کے قریب ایک گاؤں میں جہاں کچھ جاننے والے
پہلے سے رہتے ہیں جا کر رہا جائے۔ وہیں بچہ ہو۔ حمید گاؤں والوں
کی ضرورت کی چیزوں کی چھوٹی سی دوکان رکھ لے۔ ایک بکری پال لی
جائے اور مرغیاں بڑھالی جائیں اور اس طرح گزر بسر کی صورت
نکالی جائے سسرال جانے کو نہ عابدہ کا جی چاہتا تھا نہ حمید کی غیرت

یہ قبول کرتی تھی کہ اچھے زمانہ میں جن ماں باپ سے بگڑ کر الگ ہوا تھا وقت کے وقت ان کا آسرا تکے۔

تیسرے دن حمید اور عابدہ اپنے بچوں اور مختصر سامان کو لے کر گاؤں میں اٹھ آئے۔ ایک چھپر کا کچا جھونپڑا جس میں دو کوٹھریاں تھیں ڈیڑھ روپے کرایہ پر مل گیا حمید نے پندرہ روپے کا دوکان کے لئے کچھ سامان خریدا۔ بکری ایک جاننے والے سے ادھار خرید لی گئی اور دونوں میاں بیوی نے ہمت سے کام شروع کیا۔

عابدہ تین دن سے درد میں تڑپ رہی تھی۔ گھر والے تین وقت سے بھوکے تھے مگر کھانے پکانے کا کیا ذکر۔ عابدہ کو اپنا ہی ہوش نہ تھا دونوں مہترانیاں جو گاؤں میں بیک وقت دائی، ڈروا لف اور لیڈی ڈاکٹر سمجھی جاتی تھیں اپنا سارا علم، پورا زور اور تمام عقل صرف کر چکی تھیں لیکن بچہ نہ آج ہوتا تھا نہ کل۔ آس پاس کی پڑوسنیں بار بار آتیں اور اپنی بیتی ہوئی باتیں سناتیں، کچھ ترکیبیں بتاتیں، افسوس کرتیں اور چلی جاتیں۔ تین چار اچھے کھاتے پیتے گھروں میں بھی عابدہ کا ملنا جلنا تھا ان میں سے دو ایک نے اپنے نوکر خیر سلا کو بھیجے مگر کسی اللہ کی بندی کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ سب لوگ بھوکے ہیں انھیں کھانا کھلا دیا جائے آخر ایک پڑوس کی عورت کو جس کا میاں چوکیدار تھا یہ خیال تھا کہ وہ تمام کو باجرے کی روٹی اور سرسوں کا ساگ پکا کر لائی تب باپ اور بچوں کے پیٹ کے

دوزخ میں ایندھن گیا اور آنکھیں کھلیں۔

عابدہ کی ایک ہم وطن عورت بیگم جمیل نے بھی اسی گاؤں کے قریب اپنی کوٹھی بنوائی تھی۔ انھیں عابدہ کے حال کی خبر ہوئی تو وہ ملازمہ کو لے کر اس کے ہاں آئیں۔ ذرا سی کوٹھری میں دس دس عورتیں جمع تھیں۔ اپلوں کی آگ جل رہی تھی اور تمام کوٹھری میں دھواں گھٹا ہوا تھا۔ عورتوں کی چاؤں چاؤں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ باہر چھپر میں حمید سر پکڑے پریشان بیٹھا تھا بچے روتے پھر رہے تھے اور عابدہ ایک بان کی کھری چارپائی پر مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی بیگم جمیل نے جاکر عورتوں کو ہٹایا۔ آگ نکلوائی اور حمید سے کہا میرے ہاں سے سائیکل لے کر جاؤ اور قریب کے سنٹر کی دائی کو جاکر ابھی لے آؤ حمید جانے سے جھجکا یا تو اسے ڈانٹا اور ہلتھ وزیٹر کے نام ایک پرچہ لکھ دیا۔ حمید گیا اور کوئی دو گھنٹے بعد ٹرینڈ دائی کو لے کر آ گیا۔ اس نے لینے سے سارے جتن کئے آخر رات کے گیارہ بجے چار دن کی انتہائی تکلیف کے بعد عابدہ کے یکے بعد دیگرے دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ بچے کیا عجیب قسم کی گھناؤنی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سے ... نیم جان۔ زرد رنگ نکلے سے ہاتھ پیر اور بڑے بڑے سر۔ پرواہ رے ہندوستان اماں باپ دونوں خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ اللہ نے ایک چھوڑ دو دو بچے ایک ساتھ عطا کر دئیے

بیگم جمیل نے جیب سے دائی کو لے دے کر رخصت کیا اور ڈیڑھ دو بجے اپنے گھر واپس آئیں۔ عابدہ اور حمید دونوں کے دل پر ان کی ہمدردی نے گہرا اثر ڈالا۔

دو بچوں کی خبر سن کر سارا گاؤں دیکھنے کے لئے اُمنڈ آیا۔ کسی کو ذرا بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ غریب شدید تکلیف اٹھا چکی ہے۔ اتنی کمزور ہے اسے آرام کرنا چاہیئے۔ جو آتا عابدہ اداس اور کمزور مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی، محبت سے بٹھاتی۔ پان دان نہ دے سکنے کی معذرت کرتی اور فخر آمیز انکسار کے ساتھ گودڑ میں لپٹے کل بل کرتے دونوں بچوں کو دکھا کر کہتی "جب جی جائیں تب بات ہے"

مہینہ بھر کے اندر اندر ماں کا دودھ نہ مل سکنے کی وجہ سے پہلے لڑکا اور پھر لڑکی دونوں چل بسے۔ عابدہ اپنی بدنصیبی پر زار زار روتی کہ اتنی مصیبت اٹھانے پر بھی بچے نہ بچے۔ دو مہینے تک اسے جاپے کا بخار آتا رہا مگر آخر گاؤں کے رحم دل حکیم کے علاج سے جاتا رہا۔

بیگم جمیل تین مہینے بعد اپنے میکے سے واپس آئی تھیں آج بچے کی سالگرہ کا میلاد تھا۔ شہر اور گاؤں کی بہت سی ملنے والیاں آئی ہوئی تھیں اور میلاد کے بعد بات چیت ہو رہی تھی ظاہر ہے کہ سوا جنگ کی گرانی کے اور کس موضوع پر گفتگو ہو سکتی تھی۔ ایک طرف عابدہ بھی چپ چاپ بیٹھی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"اے ہے بہن غضب خدا کا تین ساڑھے تین چھٹانک کا گھی، تین سیر کا آٹا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑتا۔ ایسا کال تو نہ دیکھا نہ سنا"

"میں پرسوں کپڑا خریدنے گئی تھی کیا بتاؤں سب سے زیادہ آگ تو کپڑے ہی کو لگی ہوئی ہے چار آنے گز کا کپڑا سوا، ڈیڑھ روپے گز، بارہ چودہ آنے گز کا ریشم سات آٹھ روپے گز۔ ڈھائی سو کا کپڑا لیا جس میں صرف دو ریشمی ساڑھیاں ہیں دو سوتی جوڑے میرے اور دو بچے کے؟

"سنا ہے کپڑے کی قیمت پر کنٹرول ہونے والا ہے اس سے کپڑا سستا ہو جائے گا۔"

"جب ہو جائے تب جانیں۔ اور پھر کنٹرول کے بعد تو چیز عنقا ہو جاتی ہے۔ اب برا بھلا مہنگا سستا مل تو جاتا ہے پھر بازار میں سے کپڑا غائب ہی ہو جانے گا۔"

"کیا کھانا کیا کپڑا اور استعمال کی چیزیں سب ہی کو آگ لگی ہے جوتوں کے دام دس گنے ہو گئے۔ معمولی سے سینڈل خریدے ہیں ۱۹ روپے ۱۴ کے آئے ہیں بہن کی شادی تھی اس کے لئے گھڑی خریدنے جو گئی تو معمولی سی گھڑی سوا سو روپے کو ملی۔ سوئے آٹھ نو روپے کے فونٹن پن ستر پچھتر روپے کے ملنے لگے ہیں۔"

"بہن میرے سوٹ کیس اور بستر بند سب پرانے ہو گئے تھے۔ سوچا لاؤ کم سے کم ایک ہولڈال اور ایک سوٹ کیس لے لوں روز کہیں آنا جانا رہتا ہی ہے تو دام سن کر حیرت میں رہ گئی پورے دس گنے دام ہو گئے ہیں اپنا سا منہ لے کر واپس چلی آئی۔"

"سونا تو ۸۰ روپے تولہ سے بھی بڑھ گیا لڑکیوں کی شادی کیسے کی

جائے"۔ بیگم جمیل نے کہا "بہن سونا اور ریشم اور تکلفات کی اشیاء کا ذکر چھوڑ دو۔ معمولی روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ انسان کو زندگی گزارنی مشکل ہوتی جاتی ہے ہم لوگوں کو معمولی حیثیت سے کھانے پہننے کی کوئی خاص تکلیف نہیں اچھا نہیں برا میسر تو ہے۔ غریبوں کی حالت دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے بچارے کیسے گزارہ کرتے ہوں گے"

بہن یہ تو نہ کہو غریب ہم سے لاکھ درجہ اچھے ہیں۔ ان کی تنخواہیں نہیں بڑھیں؟ مزدوریاں چوگنی نہیں ہو گئیں۔ کسانوں کے تو سب سے زیادہ مزے ہیں۔ اناج کے دام کتنے بڑھ گئے مصیبت تو ہم جیسوں کی ہے۔ گنی بوٹی نپا شوربا" ایک اسکول ماسٹر کی بیوی بولیں۔

"غریب۔ غریب تو عیش کر رہے ہیں۔ غضب خدا کا سات سات روپے روز ان کو مزدوری کے مل جاتے ہیں۔ اس لئے تو کمینوں کے دماغ عرش معلی پر پہنچ گئے ہیں۔ سچ ہے ذلیل کے پیٹ میں روٹی پڑی اور اس کی ذات اچھلی" ایک رشوت خوار تحصیل دار کی بیگم صاحبہ نے گہر افشانی کی۔

"بھئی یہ بھی خوب رہی۔ مزدور عیش کرتے ہیں، سات روپے روز پاتے ہیں تو دن رات خون پسینہ ایک نہیں کرتے؟ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ مصیبت بھر کر بھی پیسہ نہ لیں۔ حرام کی کمائی تو نہیں کھاتے، محنت سے روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ مگر حرام خوروں کو یہ بھی شاق گزرتا ہے" ایک کمیونسٹ خیالات کی لڑکی نے کہا۔ تحصیلدار صاحب کی بیوی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا وہ کچھ سخت جواب دینے والی ہی تھیں کہ بیگم جمیل نے بات ٹالنے کو کہا۔

"مزدوری بھی بڑھی ہے اور تنخواہیں بھی۔ نوکریاں بھی خوب مل رہی ہیں۔ مگر چیزوں کی نایابی سے امیر غریب سب ہی کو یکساں تکلیف ہے۔ شکر منگاؤ نہیں ملتی۔ گیہوں بھنیوں کے لئے بازار میں سے غائب، گڑ کا کنٹرول ہوا تو وہ بھی ناپید ہو گیا۔ مٹی کا تیل گلاب کے عطر سے زیادہ نایاب۔ ان روز مرّہ کی چیزوں کی نایابی عام لوگوں کو جس قدر پریشان کرتی ہے اس کا ہم لوگ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ گورنمنٹ سروس کی وجہ سے یا ذاتی اثر او دوستوں کے وسیلے سے ہم لوگوں کو آسانی سے یہ سب ضروریات فراہم ہو جاتی ہیں۔ سال بھر کا سامان گھر میں بھر لیتے ہیں مشکل ان کی ہے جن کا اس قسم کا کوئی اثر نہیں۔"

مسز جمیل کی ایک دوست جو پابندی سے اخبار کا مطالعہ کرتی تھیں بولیں "تم نے یہ بھی سنا بنگال کا قحط روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سینکڑوں فاقہ زدہ لوگ روز سڑکوں بازاروں میں مردہ یا نیم مردہ پڑے ملتے ہیں آٹا اور چاول جیسے بازاروں سے عنقا ہو گیا۔ ہاں چور بازار سے دس گنے دام پر جتنا چاہو لے لو۔"

"بنگال کا حال سن سن کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں خدا ان بچاروں کے حال پر رحم کرے۔"

"تمام ہندوستان کے لوگ ہزاروں روپیہ چندہ کر کے بھیج رہے ہیں باہر کے ملکوں سے بھی لوگ مدد کر رہے ہیں مگر وہاں کی حالت کسی طرح نہیں سنبھلتی۔"

"بھلا کہیں پھیوں پھیوں بھی تالاب بھرتا ہے جب تک قحط کے اصلی اسباب دور نہ کئے جائیں، ان کا تدارک نہ کیا جائے قحط کیسے ختم ہو سکتا ہے۔ چور بازار کے ظالم سیٹھ۔ رشوت باز حکام، بے پروا اور بے درد حکومت کو جب تک ان مظلوموں کی حالت کا احساس نہ ہو۔ یہ گتھی سلجھنے والی نہیں۔" کمیونسٹ لڑکی نے دردناک لہجے میں کہا۔

"میں نے تو ایسی بری بری باتیں سنی ہیں کہ کیا بتاؤں۔ عورتیں مٹھی بھر چاول کے بدلے اپنے بچے بیچ دیتی ہیں۔ ان کی عزت آبرو تک خطرے میں ہے........ کیا بتاؤں لوگ کیا کیا کہتے ہیں۔"

"ہم سب کو مل کر حسب حیثیت بنگال کے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے چندہ دینا چاہیئے" مسز جمیل نے کہا۔

"اے یہاں نہ جانے اپنا ہی کیسے پورا پڑتا ہے اور پھر دو چار روپیہ ہم نے دے بھی دیئے تو ان کا کیا بھلا ہوگا" اسکول ماسٹر کی بیوی نے بیزاری سے جواب دیا۔ "میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اپنے چچازاد بھائی کو لکھوں کہ کلکتے سے آتے ہوئے دو چار بارہ چودہ برس کے لڑکے لڑکیاں لیتے آئیں ہم لوگ انھیں رکھ لیں گے انھیں کھانے پینے کو ملے گا اور ہماری نوکروں کی مشکل حل ہو جائے گی۔" تحصیلدار کی بیوی نے کہا

"اے بھائی میں نے تو ان سے بہت کہا مگر وہ کہتے ہیں کہ اس شرط پر منگانے دوں گا کہ ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھو۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کون سا ہمارے گھر میں ہن برس رہا ہے کہ ان بچوں کو پالتے پھریں

نوکر رکھنے کی بات دوسری ہے۔ اخبار خواں بہن نے ٹھنڈی سانس بھری "جب تک ہم لوگوں میں یہ بے حسی اور خود غرضی رہے گی اس بدنصیب ملک کی حالت کبھی نہیں سنبھل سکتی۔"

"میرے میاں بنگال چندہ بھیج چکے ہیں۔"

"میں اُن سے پوچھ کر بتاؤں گی۔"

"میں آپ کو خط میں لکھ بھیجوں گی۔"

عابدہ جو دیر سے ان سب کی گفتگو غور سے سن رہی تھی اٹھ کر بیگم جمیل کے پاس آئی اور چپکے سے بولی "بہن بنگال کی حال سن کر میرا دل بہت دکھا یہ پانچ روپے لائی تھی کہ آپ کی معرفت گیہوں منگوا لوں۔۔۔۔ پر اب یہ نہیں ہو سکتا۔ گھر میں باجرہ ہے کام چل جائے گا۔ آپ یہ روپے بنگال بھیج دیجئے گا۔" عابدہ اتنا کہہ سلام کر برقعہ اوڑھ چلی گئی۔ بیگم جمیل نے ملامت آمیز نظروں سے سب بیگموں کو دیکھا اور یہ بات بتائی سب کی نظریں نیچی تھیں اور کھسیانی ہنس ہنس کر اپنی شرمندگی چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

عابدہ اپنے پھٹے دوپٹے اور حمید کے پاجامے کو آٹھویں نویں بار مرمت کر کے پہننے کے قابل بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ حمید ہفتہ بھر سے جاڑا بخار میں مبتلا تھا۔ دوکان کا سامان ختم ہو گیا تھا اور دونوں میاں بیوی بہت پریشان تھے۔ آج بخار کچھ ہلکا ہوا تو حمید پاس کے قصبے میں سامان خریدنے چلا گیا تھا۔ بچہ قصبے کے اسکول میں گیا ہوا تھا اور بچی

آٹا گوندھ رہی تھی کہ باہر سے کئی آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی۔ عابدہ نے یونہی جھانک کر دیکھا۔ دیکھ کر اس نے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ چار آدمی حمید کو چارپائی پر ڈالے لئے آرہے تھے پریشانی اور بدحواسی میں عابدہ کو پردے وردے کہیں کا خیال نہیں رہا۔ روتی پیٹتی باہر نکل آئی "ہے ہے انھیں کیا ہوا... خدا کے لئے یہ بتا دو کہ زندہ تو ہیں" حمید کو اندر کوٹھری میں لاکر لٹا دیا گیا۔ عابدہ کو لوگوں نے بتایا کہ حمید بخار میں بدحواس سڑک پر جا رہا تھا۔ سامنے سے فوجی لاری آرہی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن دیا۔ حمید نے نہیں سنا ڈرائیور نے موٹر روکنے کی کوشش نہیں کی اور لاری حمید کو گراتی ہوئی آگے نکل گئی بڑی خیر ہوئی کہ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ جان بچ گئی آس پاس کے دوکانداروں نے رحم کھا کر گاؤں تک پہنچا دیا۔

حمید بے ہوش پڑا تھا۔ عابدہ اور بچوں کا روتے روتے برا حال تھا بڑی دیر بعد جب حمید کو ہوش آیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ مگر وہ درد سے تڑپ رہا تھا بائیں پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور داہنا ہاتھ زخمی تھا۔ بیگم جمیل کو خبر ہوئی تو انھوں نے ایک ڈاکٹر کے نام خط لکھ کر دیا اور اپنے ملازم کے ساتھ تانگے پر اسپتال بھجوا دیا۔ تین دن بعد حمید اسپتال سے آگیا۔ ہاتھ کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی اور پاؤں کی ہڈی بٹھا کر اس پر پلاسٹر چڑھا دیا تھا۔ بیگم جمیل نے ملازمہ کو بھیج کر حال دریافت کیا اس نے بتایا کہ "بچارے سے اٹھا بیٹھا تک نہیں جاتا۔ بڑا چڑچڑا اور بدمزاج ہو گیا ہے۔ بات بات پر بیوی سے الجھ پڑتا ہے۔ بیوی بیچاری دن رات خدمت میں لگی رہتی ہے۔ پیشاب پاخانہ

تک پلنگ پر کراتی ہے دیکھے سے دل کٹتا ہے۔"

بیگم جمیل اپنی مصروفیتوں میں عابدہ کو تقریباً بھلا چکی تھیں کہ ایک دن انھوں نے اسے باورچی خانہ میں بیٹھے دیکھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ چھاچھ لینے آئی ہیں انھوں نے عابدہ کو کمرے میں بلا لیا۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو گیا تھا اور آنکھوں کے گرد گہرے گہرے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بیگم جمیل نے پوچھا "حمیدہ کا کیا حال ہے" اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی۔ شہر میں میرے ایک رشتے کے بھائی رہتے ہیں وہ اپنے ہاں لے گئے ہیں وہاں علاج آسانی سے ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی اور کچھ ایسی نظروں سے بیگم جمیل کو دیکھا جس کا وہ مطلب نہ سمجھنے پر بھی بے چین ہو گئیں۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بیگم جمیل نے تذکرۃً کہا نوکر کی بڑی دقت ہے ماما نوکری چھوڑنے کو کہتی ہے۔ بڑی مشکل ہو جائے گی۔ عابدہ نے بڑی کوشش سے ہونٹوں پر مردہ تبسم پیدا کیا اور رک رک کر بولی "آپ مجھے نوکر رکھ لیجیے۔" بیگم جمیل نے کہا "بہن کیسی باتیں کرتی ہو تم تو میری برابر کی بہن ہو خدا نہ کرے نوکری کا کیا ذکر۔" عابدہ کی آنکھوں میں آنسو کانپ رہے تھے اور آواز میں بھی تھرتھراہٹ تھی "نوکری کرنا عیب تو نہیں اور اب تو مجھ سے بچوں کا کچھ کاٹنا نہیں دیکھا جاتا" بیگم جمیل نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "میں تو تمھیں اپنی بہن سمجھتی ہوں اور تم اتنی غیریت برتتی ہو جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہو شرم کی کوئی بات نہیں" عابدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی

لڑیاں جاری ہوگئیں" آپا تم مجھے برسوں سے جانتی ہو کتنے سال اس دہلی
میں رہتے ہو گئے مگر آج تک کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی
روکھی ملی روکھی، سوکھی ملی سوکھی صبر شکر سے کھا لیتے تھے۔ حامد کے ابا کی اس
دفعہ کی بیماری نے مجھے کہیں کا نہ رکھا گھر میں جو بھی تھا سب ختم ہو گیا۔ بکری
بیمار ہے۔ مرغیوں پر بھی آفت آئی کچھ مر گئیں جو ہیں وہ بھی انڈے نہیں دیتیں
تین دن سے میرے بچے فاقے سے ہیں کل رات ایک ایک پیسہ کے چنے
دونوں بچوں کے لئے لیتے تھے۔ خود میں نے اگر چار وقت سے کچھ کھایا ہو
تو حرام چیز کے برابر ہے۔" بیگم جمیل سر سے پاؤں تک لرز گئیں۔ "اُف
میرے پڑوس میں یہ مصیبت زدہ شریف زادی اور اس کے بچے تین دن کے
فاقے کر رہے ہیں اور مجھے خبر بھی نہیں، پروا بھی نہیں۔ اُف ہم اپنے گرد و
پیش کے حالات سے کس قدر بے خبر رہتے ہیں غریب لیکن شریف اور باحیا
لوگوں کی حالت کا کس قدر غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ان کی
حالت اس قدر ابتر ہے۔ یا اللہ میں بڑی گنہ گار ہوں" انہوں نے منہ پھیر کر
اپنے آنسو پونچھے اور تین چار سیر آٹا اور دال پوٹلی میں باندھ کر ماما سے چھپا
کر عابدہ کے برقعے میں دے دیا اور پانچ روپے ہاتھ پر رکھ کر بولی "جب اور
ضرورت پڑے تو مانگ لینا اس وقت زیادہ نہیں دے سکتی۔" عابدہ بیچاری
یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کسی کا احسان لے کر کس طرح شکریہ ادا کرنا یا دعائیں
دینا چاہئے۔ ہاں اس کے خاموش آنسو اس کے دل کی حالت اور احسان
مندی کا راز افشا کر رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے اتنا اور کہا "ان کے

پاس کپڑے بالکل نہیں رہے۔ اگر...... ...."

"تم جاؤ۔ بچوں کو روٹی پکا کر کھلاؤ۔ میں ابھی تمہارے اور حمید کے لئے کپڑے بھیجتی ہوں" بیگم جمیل نے عابدہ کے جھیر جھیر دوپٹے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا اس سے پہلے وہ جب کبھی عابدہ سے ملی تھیں اسے صاف ستھرے اور ثابت کپڑوں میں دیکھا تھا۔ اس لئے انھیں یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان لوگوں کی حالت اس قدر ابتر ہے۔

کہیں چھ مہینے بعد جا کر حمید اس قابل ہوا کہ چلنے پھرنے لگے۔ اگرچہ اس عرصے میں بیگم جمیل اور دو چار اور رحم دل لوگوں نے عابدہ کی مدد کی مگر چار آدمیوں کا خرچ اور یہ قیامت کی مہنگائی! بچاری خود ایک وقت کھاتی بچوں کو جیسی روکھی سوکھی نصیب ہوتی دونوں وقت دیتی۔ حمید کے لئے ہلکی غذا کا انتظام بھی کرنا پڑتا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ بجھڑ کا آٹا اور روکھی روٹیاں کھاتے کھاتے آنتوں میں خراشیں پڑ گئیں اور مستقل پیچش رہنے لگی۔ دو چار مرتبہ اسبغول مانگ کر کھایا، چھاچھ بھی پی مگر بیماری جڑ پکڑ چکی تھی بھلا کیا جاتی۔ بارے خدا نے اس کی دلی دعائیں سن لیں اور حمید تندرست ہو گیا۔ عابدہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ ادھار لے کر بتاشے منگائے اور پڑوسنوں کو جمع کر کے میلاد کر ڈالا۔ اتنی مصیبتوں کے باوجود آج اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

دو چار آدمیوں کی کوشش سے حمید کو بیس بائیس روپے کی ایک نوکری

ل گئی۔ جاڑا گزر چکا تھا۔ مرغیوں نے انڈے دینے شروع کر دیئے۔ بکری نے بھی بچہ دے دیا۔ اب اس کنبے پر سے وہ انتہائی سختی کا وقت گذر چکا تھا۔ عابدہ روکھی سوکھی روٹی کھا کر بہت خوش رہتی تھی کہ دوسروں کے احسان اور محتاجی سے نجات ملی جس سے اسے سخت روحانی اذیت ہوتی تھی۔

اگرچہ وہ اب بھی گھر کا کام کاج کرتی مگر اس کی صحت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ حمید نے ایک دن حکیم کو نبض دکھائی تو اس نے کہا کہ شاید پیٹ میں بچہ ہے۔ کمزوری بہت ہی بہت احتیاط اور پرہیز کی ضرورت ہے بچے کا نام سن کر عابدہ کا دل دہل گیا۔ اس مفلسی اور گرانی میں ایک اور جان کا اضافہ اور صحت کی یہ حالت!! اسے اپنی زندگی سے مایوسی سی ہونے لگی پیچش کی شکایت روز بروز بڑھتی جاتی تھی حمید کی ماں بیٹے کی بیماری سے پگھل گئی تھیں اور خود دیکھنے بھی آئی تھیں اس زمانے میں ساس بہو میں صلح سی ہوگئی تھی اب حمید نے اصرار کر کے بیوی کو راضی کیا کہ وہ ساس کے پاس چلی جائے۔ عابدہ کا جی تو نہ چاہتا تھا مگر میاں کے کہنے سے مجبور ہوگئی۔ حمید خود ابھی کمزور تھا اور نوکری سے بالکل تھک کر واپس آتا تھا۔ تیمارداری یا گھر کا کام اس کے بس کا نہ تھا۔

تین مہینے تک عابدہ سسرال میں رہی۔ ایک دن حمید کے نام چھوٹے بھائی کا کارڈ آیا۔ "بھاوج کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تمہیں یاد کرتی ہیں فوراً آؤ۔" حمید جا کر بیوی کو لے آیا۔

عابدہ کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بخار ہر وقت رہتا تھا پیچش اب خونی ہو گئی تھی۔ اور پیٹ تھا کہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ دائی نے دیکھ کر کہا صاف دو بچے معلوم ہوتے ہیں۔

حمید نے اسی رشتے کے سالے کے ہاں عابدہ کو رکھا پہلے حکیم کا علاج کیا آخر یار کر ڈاکٹر کا علاج شروع کرایا۔ مگر اس کی حالت کسی طرح سنبھلنے میں نہ آتی۔

ایک دن حمید کام سے واپس آ کر بیوی کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ درد سے تڑپ رہی ہے۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو اس نے کہہ دیا کہ مریضہ انتہائی کمزور ہے بچہ قدرتی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا اور آپریشن بھی خطرناک ہے کیونکہ جسم میں خون بالکل نہیں۔ دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔

حمید کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی گیارہ برس کا بسا بسایا گھر اجڑ رہا تھا۔ زور زور سے رونے لگا۔ باپ کو روتا دیکھ کر دونوں بچے بھی رونے لگے۔ عابدہ نے آواز سن کر اندر بلایا اور پاس بٹھا کر رک رک کر بولی "حامد کے ابا میں میں دنیا سے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ نہیں نہیں مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب نہ بچوں گی۔ مجھے مرنے کا تو کوئی افسوس نہیں۔ اچھا ہے ان دنیا کی مصیبتوں سے بچ جاؤں گی۔ گنہگار ضرور ہوں پر جو جو مصائب یہاں جھیلے ہیں ان سے شاید گناہ دھل گئے ہوں اور دوسری دنیا میں آرام کا سانس ملے مجھے دکھ یہ ہے کہ تم اور میرے دونوں بچے اور زیادہ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ کوئی روٹی پکا کر

کھلانے والا بھی نہ ہوگا۔۔۔۔ خیر اللہ مالک ہے۔ پر دیکھنا اس کا خیال رکھنا کہ میرے بچے۔۔۔۔ بھوکے نہ رہنے پائیں۔" عابدہ کی خشک آنکھوں سے ایک دم آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اپنی فاقہ کشی کی مصیبت اس کی نظروں میں پھر گئی۔

حمید نے روتے روتے کہا "ہائے عابدہ میں تمھیں کوئی سکھ نہ دے سکا تمھیں ساری عمر میں کبھی آرام نہ ملا۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ تمھیں کچھ آرام دے سکتا۔ دل کھول کر علاج دوا بھی نہ کر سکا۔۔۔۔ ہائے میری بدنصیب بیوی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

عابدہ نے روتے ہوئے اپنا زرد کانپتا ہوا ہاتھ حمید کے ہاتھ پر رکھ دیا "یہ نہ کہو۔ تم نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔ میں پیدا ہی بدنصیب ہوئی تھی۔ خاندان نے، سماج نے سسرال نے مجھے دھتکارا، ٹھکرایا اور میرے دل پر آرے چلائے مگر تم نے اس پر مرہم رکھا۔ ہمیشہ میری دلجوئی اور محبت کی۔ تم مجھے تیس روپے لا کر دیتے تھے جو مجھے تین سو سے بڑھ کر تھے۔ آہ۔۔۔۔ کیا اچھا زمانہ تھا۔۔۔۔ ہم کیسے آرام اور سکھ سے قناعت اور شکر کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ ہم نے کبھی کسی امیر سے حسد نہیں کیا۔۔۔۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ مگر نہ جانے یہ لڑائی۔۔۔۔ یہ منحوس لڑائی کس بری گھڑی شروع ہوئی تھی جس نے ہمارا سکھ چین، غیرت، خودداری، صبر قناعت، سلوک اتفاق۔ سب خاک میں ملا دیا۔ ہمیں کیا کچھ سہنا نہ پڑا نہ جانے ہم جیسے اور کتنے لوگ اسی طرح مصیبتیں سہہ رہے ہیں۔۔۔۔ سُنا ہے

بنگال میں یہاں سے بھی زیادہ برا حال ہے..... حمید کے ابا۔ یہ لڑائی کرنے کرنے والے کس دل کے لوگ ہیں۔ کیا ان کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر کی سلیں رکھی ہیں جو لاکھوں آدمیوں کو اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے دیکھتے ہیں اور ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ ان کا دل نہیں دکھتا؟ اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو آج ہم آرام سے بسر کرتے ہوتے۔ تم کیوں اس فوجی لاری سے ٹکراتے۔ کیوں بیمار پڑتے۔ میں کیوں دوسری کی محتاج ہوتی ...... کیوں فاقے کر کے مصیبت اٹھاتی..... آہ کیوں اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتی۔ آہ..... اُف..... ہائے"

حمید ساکت بیٹھا عابدہ کی نشتر جیسی باتوں کو سنتا رہا جیسے اس کی حس جاتی رہی ہو۔

رات کو دو بجے عابدہ دنیا کے سب دکھوں سے چھوٹ گئی۔

تجدیدِ اُلفت

سہیل اور نصرت کی شادی کو ابھی پندرہ بیس ہی دِن ہوسے تھے کہ سہیل نے سیر کے لئے کشمیر جانے کا قصد کر لیا۔ سہیل کے عزیز رشتہ داروں نے دانتوں تلے انگلی دبائی۔ "توبہ توبہ چار دن کی دلہن اور پہاڑوں پر دولہا کے ساتھ سیر کو جائے؟ ہاں بھئی نئے زمانے کے دولہا دلہن جو نہ کریں تھوڑا ہے"۔ نصرت کی بڑی بہن نزہت کو یہ تنقید بہت ناگوار گزری اور چونکہ ان کی لاڈلی بہن پر حرف آتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے لوگوں سے کہا "نصرت نے تو آج تک مارے شرم کے دولہا سے بات بھی نہیں کی یہ سب دولہا میاں کی باتیں ہیں جب وہ زبردستی کرتے ہیں تو لڑکی بے چاری کیا کرے اسے جانا ہی پڑے گا"۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ کشمیر جانے کے لئے نصرت ہی کا اصرار تھا سہیل پہلے جا چکے تھے اور نصرت سے کشمیر کی دلفریبیاں بیان کیا کرتے تھے جس نے نصرت کو بے چین کر دیا تھا اور آخر کار اس نے سہیل کو اس پر راضی کر ہی لیا کہ فوراً کشمیر چلیں۔ دونوں اپنے کنبے والوں کی نکتہ چینیاں اور اعتراض سنتے اور تنہائی میں خوب ہنستے۔ سہیل کہتا "بے چاری نصرت مظلوم لڑکی!!" سہیل

اس پر ابھی سے ظلم کر رہا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ کشمیر جیسی خراب جگہ چل
کیسی فرماں بردار بیوی ہے فوراً چلنے پر راضی ہو گئی۔" نصرت مسکرا کر اس
کا ہاتھ پکڑ لیتی اور کہتی "نئی دلہن پر ایسا ظلم؟ افسوس بے چاری کے حال پر"
پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑتے اور کشمیر کے سفر کے متعلق باتیں ہونے لگتیں
مئی کی بیس تاریخ کو سہیل اور نصرت سری نگر روانہ ہوئے۔ یہ دونوں
کار میں تھے اور باورچی نصرت کی خادمہ اور دوسرے نوکر مع اسباب کے لاری
میں۔ نصرت شملہ اور مسوری اکثر جا چکی تھی یا ننھیال تک اسے کشمیر کے راستے میں
کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی مگر پیر پنجال کی چڑھائی کے شروع ہوتے ہی
اس کا خیال بدل گیا۔ چاروں طرف سربفلک برف پوش پہاڑ، بیچ میں سرسبز
وادی چشموں کی تیز رفتاری اور سڑک کے پیچ وخم نے اسے اپنا گرویدہ کر لیا
سرنگ پر جو نو ہزار فٹ کی بلندی پر تھی، نصرت نے عمر بھر میں پہلی مرتبہ برف
دیکھا۔ برف کی دیواریں کھڑی تھیں اور تمام سڑک پر برف کا فرش بچھا ہوا تھا
اور آگے چلے تو سری نگر کی حسین وادی کی جھلک نظر آئی جسے دیکھ کر نصرت
حیرت میں رہ گئی۔ قاضی گنڈ سے سڑک ہموار اور راستہ انتہائی خوشنما ہو گیا۔ سڑک
کے دونوں طرف شمشاد کے اونچے سفید اور پتلے درختوں کی صف بستہ قطار
جہلم کا پیچ وخم کے ساتھ بہنا اور اس کے کنارے بید مجنوں کے خوش رنگ
نازک پودوں کے جھنڈ، چنار کے عظیم الشان درخت، سرسبز دھان کے کھیت
گل لالہ کے تختے اور وادی کے دونوں جانب برف پوش پہاڑ، یہ نظارہ اتنا
خوشنما اور ایسا نظر فریب تھا کہ نصرت ان میں محو ہو گئی وہ اس وقت نہ صرف

سہیل کی موجودگی بلکہ اپنے وجود سے بھی بے خبر سی تھی اور ٹکٹکی باندھے ان دلکش
نظاروں کو دیکھ رہی تھی۔ سہیل بہت دلچسپی سے اس کی محویت دیکھتا رہا کچھ
دیر بعد نصرت کا شانہ چھوا۔

سہیل۔ اوہو اتنی محویت، ہمیں تک فراموش کر دیا؟

نصرت۔ (یکایک، چونک کر) جی؟ کیا کہا آپ نے؟

سہیل۔ یہ کہہ رہا ہوں کشمیر کے حسن نے تمھیں ایسا فریفتہ کر لیا کہ مجھے تک بھول
گئیں؟

نصرت۔ (مسکرا کر) بھلا آپ بھولنے کی چیز ہیں؟ مگر دیکھیے تو یہ سرسبز
کھیت، یہ لالے کے تختے، یہ دلکش چشمے، یہ خم کھاتا ہوا دریا سرخ و
سفید حسین بچے، کیا یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں جنھیں دیکھ کر انسان محو
حیرت ہو جائے۔

سہیل۔ پہلے جب میں آیا ہوں تو میرا بھی یہی خیال تھا۔

نصرت۔ (حیرت سے) کیا آپ کا خیال بدل گیا؟ اب کشمیر کی خوبصورتی میں
کچھ فرق آگیا ہے؟

سہیل۔ نہیں کشمیر کی دلفریبی ویسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ مگر اب میں
نے ان سب سے زیادہ دل کش ایک اور چیز دیکھی ہے جس کے آگے
یہ سب ہیچ نظر آتے ہیں۔

نصرت۔ وہ کیا؟ میرے خیال میں ہندوستان ہی میں کیا تمام دنیا میں اس سے
زیادہ خوبصورت نظارہ نہ ہوگا۔ بھلا وہ کون جگہ ہے جو اس سے زیادہ

خوبصورت ہے۔"

سہیل۔ میں نے جگہ کا لفظ تو استعمال نہیں کیا تھا۔ نصرت تم تو ابھی سے کشمیر پر عاشق ہوگئیں؟ ابھی تم تو دیکھا ہی کیا ہے۔ یہاں تو ایسے ایسے خوبصورت مقام ہیں جنھیں دیکھ کر تم جنت کی آرزو چھوڑ دو گی۔

نصرت۔ تو پھر وہ کون چیز ہے جس کی وجہ سے آپ کو یہ نظارے بھی اچھے نہیں لگتے۔

سہیل۔ نصرت یہ تو میں نے نہیں کہا کہ مجھے یہ نظارے اچھے نہیں لگتے مجھے تو یہ پہلے سے کئی گنا زیادہ دلکش معلوم ہو رہے ہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ میرے دل کو اس سے زیادہ لبھانے والی ایک اور چیز ہے۔

نصرت۔ اُنھ آپ تو پہیلیاں بجھواتے ہیں آخر کیا ہے وہ۔

سہیل۔ وہ ایک حسین اور بھولی بھالی لڑکی ہے جو مجھ سے لاپروا ہو کر اپنی نشیلی آنکھوں سے ان دلفریب نظاروں کو دیکھ رہی ہے۔

نصرت۔ (شرما کر) آپ ہر وقت نہ بنایا کیجئے۔

سہیل۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمھیں بنا رہا ہوں؟ کیا تمھیں اس بات کا یقین نہیں کہ مجھے دنیا میں تم سے زیادہ خوبصورت اور دل کش کوئی چیز نہیں معلوم ہوتی (اس کی جھکی ہوئی گردن اٹھا کر) کیوں کیا تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو؟

نصرت نے اپنی شرم سے جھکی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں سہیل کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنا سر سہیل کے بازو پر رکھ دیا۔

(۲)

سہیل اور نصرت کو سری نگر آتے ہوئے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے۔ اس عرصے میں ان دونوں نے سری نگر کے آس پاس کی سیر کر لی ہے۔ کسی دن نشاط اور شالامار گئے تو کسی دن ہارون اور نسیم باغ کبھی گاندربل اور وائل جا کر کھانا کھایا تو کبھی صبح ہی صبح شنکر آچاریہ کی چڑھائی سے لطف اٹھایا کبھی موٹر میں اور کبھی شکارے میں۔ اس کے علاوہ سہیل امرناتھ کلب کا اور نصرت پردہ کلب کی ممبر بھی بن گئی۔ سہیل کے تو بعض ملنے والے پہلے ہی سے تھے اب کلب جانے کی وجہ سے نصرت کی بھی اکثر عورتوں سے ملاقات ہو گئی ہے ان عورتوں میں اسے سب سے زیادہ ریحانہ پسند آئی۔ ریحانہ کا شوہر جمال کشمیر میں ایک معزز عہدے پر تھا۔ یہ لوگ چھ مہینے جموں رہتے اور چھ مہینے کشمیر۔ جمال پنجابی تھا اور ریحانہ میرٹھ کی رہنے والی۔ معمولی صورت کی جامہ زیب خوش مزاج اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ اور سری نگر کی عورتوں کی سوسائٹی میں بہت ہر دل عزیز نصرت جو یہاں آکر اپنے آپ کو بالکل اجنبی محسوس کرتی تھی پہلی مرتبہ بہت گھبرائی مگر اس کی دل کش شکل وصورت، زرق برق کپڑوں اور جگمگاتے ہوئے زیورات نے اکثر عورتوں کی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کی شرمائی ہوئی نظروں اور ہر بات پر جھجک کر منہ پر ہاتھ رکھ لینے ہی سے عورتیں سمجھ گئیں کہ یہ نئی دلہن ہے اور آپس میں اس کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ دو ایک شوخ لڑکیوں نے اس کا مذاق اڑایا جو نازک مزاج نصرت کو ناگوار گزرا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ ارادہ کر رہی تھی کہ فوراً یہاں سے چلی جائے اور پھر کبھی کلب

نہ آئے کہ ریحانہ اس کے پاس آئی اور بہت دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی اور اپنے ہاں چائے پر نصرت کی دعوت بھی کر دی۔ نصرت ریحانہ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی اور اس نے خوشی سے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اس طرح ان دونوں کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ ریحانہ پردے کی زیادہ پابند نہ تھی اس لئے سہیل کے سامنے آ گئی مگر نصرت پردے کے معاملے میں بہت سخت تھی وہ کسی طرح جمال کے سامنے آنے پر راضی نہ ہوئی۔ سہیل نے شروع میں اصرار کیا مگر جب یہ دیکھا کہ نصرت کو ناگوار ہوتا ہے تو ٹال دیا۔ ریحانہ نے خود کبھی اس پر اصرار نہیں کیا۔ نصرت کے اصرار پر کبھی کبھی ریحانہ بھی ان کے ساتھ سیر میں شامل ہو جاتی تھی جس سے نصرت کو خوشی ہوتی۔ مگر سہیل کو یہ بات بُری معلوم ہوتی تھی۔ سب نئے نئے دولہاؤں کی طرح وہ یہ چاہتا تھا کہ صرف وہ ہو اور نصرت تیسرا کوئی ان کی تنہائی میں مخل نہ ہو مگر چونکہ نصرت کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اشارتاً بھی اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔

ایک دن سہیل کلب سے واپس آیا تو نصرت مکان میں نہیں تھی۔ نوکر سے معلوم ہوا کہ ریحانہ موٹر لے کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ گئی ہیں بہت جز بز ہوا اور چپ چاپ بیٹھ کر کتاب پڑھنے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب نصرت بنفشن کا بلا ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہوئی وہ اس وقت سبز رنگ کی پوشاک پہنے ہوئے تھی اور اس کا صندلی رنگ جو آب کشمیر کی صحت بخش آب و ہوا سے گلابی ہو گیا تھا دمک رہا تھا۔ سہیل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا پری جمال بیوی کی صورت دیکھ کر غصہ کافور ہو گیا۔ مسکراتا ہوا بڑھا اور ہاتھ میں ہاتھ لے کر بولا "کہئے بیگم

صاحبہ کہاں تشریف لے گئی تھیں ؟ نصرت نے مسکرا کر کہا "ریحانہ آ کر کلب لے گئیں تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ سے بغیر پوچھے چلی گئی مگر کیا کروں ریحانہ نے مانا ہی نہیں" سہیل ہنسا "بھئی یہ ریحانہ تو میری رقیب ہو گئیں۔ جب دیکھئے ہماری دلہن کو لے کر بھاگ جاتی ہیں" نصرت نے ہنس کر سہیل کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا "آپ کو خبر بھی ہے اب میں بیڈمنٹن کھیلنے لگی ہوں" سہیل نے مصنوعی حیرت سے کہا "سچ ؟ نہیں بھئی مجھے یقین نہیں آتا" نصرت بولی "کیوں یقین نہ آنے کی کیا وجہ ہے کیا میں کھیل نہیں سکتی" ؟ سہیل نے اسی لہجے میں کہا "بھئی بیڈمنٹن بڑا مشکل کھیل ہے ٹینس سے بھی زیادہ مشکل" ! نصرت بولی "مجھے تو مشکل نہیں لگتا۔ سچ اب میں خوب کھیلتی ہوں۔ آج میں نے اور ریحانہ نے بڑی اچھی کھیلنے والی لڑکیوں کو ہرا دیا" سہیل نے کہا "ارے واقعی۔ اسی لئے تمہارا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ مگر ہم جب یقین کریں گے جب تم ہمارے ساتھ کھیلو گی اور ہمیں ہرا دو گی" نصرت نے شرما کر کہا "نہیں بھئی آپ کے ساتھ ہم سے نہ کھیلا جائے گا" سہیل بولا "آخر کیوں" ؟ نصرت نے کہا "مجھے شرم آتی ہے" سہیل نے اس کی جھکی ہوئی گردن اٹھائی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "مجھ سے شرم آتی ہے ؟ ذرا پھر تو کہنا ؟" نصرت نے اور زیادہ شرما کر سر جھکا لیا۔

اگلے دن سہیل نے نصرت سے کہا "نصرت اگر تم کہو تو کل گل مرگ چلیں"

نصرت "جی ہاں ضرور چلئے مجھے تو وہاں جانے کا بڑا شوق ہے۔ کتنے

دِن کے لئے چلے گا"
سہیل۔ بس دو چار دن رہیں گے وہاں میرے ایک دوست ہیں ان کے ہاں ٹھہر جائیں گے۔ مگر یہ بھی معلوم رہے کہ گھوڑے پر جانا پڑے گا"
نصرت۔ گھوڑے پر ؟ نہ بھئی یہ میرے بس کی بات نہیں ۔
سہیل۔ تو پھر جاؤ گی کیسے ؟
نصرت۔ ڈانڈی پر آخر وہاں ڈانڈی بھی تو جاتی ہے ۔
سہیل۔ ہاں جاتی تو ہے مگر جو لطف گھوڑے کی سواری میں ہے وہ ڈانڈی پر جانے میں کہاں ؟ تمھیں یہ اچھا معلوم ہوگا کہ اپنی وجہ سے اور لوگوں کو تکلیف دو ؟ مجھ سے تو یہ کبھی نہ ہو کہ زندہ چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار ہوں ۔
نصرت۔ اچھا تو پھر میں نہیں جاؤں گی"
سہیل۔ واہ جاؤ گی کیسے نہیں تم نہ گئیں تو میں بھی نہ جاؤں گا۔ آخر تمھیں گھوڑے پر بیٹھنے میں کیا اعتراض ہے ؟
نصرت۔ گھوڑے پر بیٹھنا آپ ہنسی کھیل سمجھتے ہیں ؟ میں کبھی عمر بھر گھوڑے کے پاس بھی نہیں گئی اگر کہیں گر گرا پڑی تو آپ کا کیا جاتے گا میری جان مفت کی نہیں ہے ۔
سہیل۔ اچھا تو کیا مول کی ہے ؟ اور میرا نہیں تو کس کا جاتے گا میری ایسی خوبصورت، ضدن بیوی ہاتھ سے جائے گی ۔
نصرت۔ (بگڑ کر) خیر جائیے ہم ضدی ہی سہی "

سہیل :۔ ناراض ہوگئیں؟ ارے تم مذاق میں بھی برا مان جاتی ہو؟

نصرت :۔ (مسکراکر) جی نہیں برا تو نہیں مانا۔ پر گھوڑے پر مجھ سے نہ جایا جائے گا۔

سہیل ۔ میری بات کا یقین کرو کہ گھوڑے سے ڈرنے کی ذرا سی بھی ضرورت نہیں۔ یہاں کے ٹٹو اس قدر سیدھے ہوتے ہیں کہ چھوٹا سا بچہ بھی بیٹھ جائے تو شرارت نہیں کرتے اور ان کے ساتھ ساتھ لگام پکڑے ٹٹو والا چلتا ہے۔ ذرا بھی ڈر نہ لگے گا۔

نصرت ۔ برقعہ اوڑھ کر گھوڑے کی سواری کیا اچھی معلوم ہوگی؟

سہیل ۔ تو نہ اوڑھنا برقعہ۔

نصرت ۔ واہ کیوں نہ اوڑھوں میں آپ کی طرح لامذہب نہیں کہ پردہ وردہ سب چھوڑ دوں۔

سہیل ۔ (ہنس کر) تو کیا میں پردہ کرنے لگوں؟

نصرت ۔ چلئے آپ ہر بات میں مذاق کرتے ہیں۔

سہیل ۔ تو بھئی برقعہ ہی اوڑھ کر چلنا منع کس نے کیا ہے۔

نصرت ۔ آپ ہنسیں گے تو نہیں۔

سہیل :۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں ہنسوں تو دانت توڑ دینا۔ بس اب تو خوش ہوئیں۔

نصرت ۔ اچھا ایک شرط ہے۔

سہیل ۔ وہ بھی کہہ ڈالو۔

نصرت۔ ریحانہ سے کہئے وہ بھی چلیں ۔
سہیل ۔ اب تو تم ان کے بغیر قدم بھی اٹھانا پسند نہیں کرتیں "
نصرت ۔ آخر آپ اس بے چاری سے کیوں خفا ہیں ۔ آپ کا کوئی حرج ہے کیا "
سہیل ۔ جی کچھ نہیں ضرور چلیں ۔ مگر جمال صاحب کو بھی لے چلنا پڑے گا
نصرت ۔ تو لے چلئے کل ان کی چھٹی بھی ہے ۔ پرسوں اتوار ہے ۔
سہیل ۔ جیسی تمہاری مرضی مجھے کوئی اعتراض نہیں ، سر تسلیم خم ہے جو مزاج میں آئے "
ریحانہ نے مسکرا کر کہا " شکریہ "
اگلے دن یہ پارٹی تن مرگ کی طرف موٹر میں روانہ ہوئی ۔ ریحانہ ان کا چھ سالہ بچہ جمیل اور نصرت و سہیل ۔ نصرت ۔ ریحانہ اور جمیل پیچھے تھے اور سہیل و جمال آگے نصرت کہتی " ریحانہ سچ کہو کیا دنیا کی تمام خوبصورتیاں کشمیر ہی کے حصے میں آگئیں ؟ ریحانہ ہنس کر جواب دیتی " مجھے تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی نہ جانے تم کیوں اس قدر لٹو ہو "
نصرت " اس لئے کہ تم یہاں آٹھ سال سے رہتی ہو تمہیں یہ خوبصورت نظارے دیکھتے دیکھتے مساوات ہوگئی ہے اور میں نے پہلی مرتبہ اس جنت میں قدم رکھا ہے "
ریحانہ " نہیں اس لئے کہ تم ابھی نئی دلہن ہو اور تمہیں آج کل دنیا کی ہر چیز حسین اور دلکش معلوم ہوتی ہے "

نصرت - ریحانہ بہن تم بے انصافی کرتی ہو۔ یہ خوش نما مناظر، یہ روح پرور ہوائیں تو ایسی ہیں کہ مردۂ صد سالہ کو بھی نئی زندگی بخشدیں مجھے یقین نہیں آتا کہ تم سچ مچ ان چیزوں سے لطف نہیں اٹھا سکتیں۔

ریحانہ "میں نے کہا نا کہ نئے دولہا دلہن کو دنیا بہت دل کش معلوم ہوا کرتی ہے۔ میں بوڑھی ہوئی اب کیا ان چیزوں سے لطف اٹھاؤں گی۔

نصرت - جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے تم تو مذاق کرتی ہو۔

ریحانہ - تو تم آخر مذاق سے اس قدر بگڑتی کیوں ہو۔

تنگ مرگ پہنچ کر موٹر رکا تو سہیل نے کہا " نصرت دیکھو کیسا خوبصورت چشمہ ہے بس اسی کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے کھانے کے بعد گل مرگ روانہ ہوں گے "

ایک بجے کے قریب یہ لوگ گل مرگ روانہ ہوئے۔ ریحانہ تو خوب مشاق تھی پھرتی سے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ مگر نصرت نے بہت شور و غل مچایا ریحانہ اور سہیل نے بمشکل سوار کیا پھر بھی وہ ڈرتی رہی مگر کچھ دیر بعد اسے لطف آنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے ٹٹو والے کو بھی ہٹا دیا اور خود ہی گھوڑا چلانے لگی۔ ریحانہ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ تھیں کبھی ریحانہ اپنا ٹٹو آگے بڑھا لیتی اور کبھی نصرت سہیل اور جمال پیچھے پیچھے آرہے تھے نصرت کو شوق اٹھا تو سب سے آگے ٹٹو کو لے گئی۔ ریحانہ منع کرتی رہی کہ ارے بھگاؤ نہیں گر جاؤ گی مگر کون سنتا ہے۔ ریحانہ نے سہیل سے کہا " بھائی

تم بھی اس کے ساتھ جاؤ کہیں گر نہ پڑے۔" سہیل نے کہا "یہ خوب تماشا ہے
بیٹھتے وقت وہ شور غل اور اب اس قدر شوق میں آئیں کہ بھٹکنے لگ
گئیں۔" جمال نے ہنس کر کہا "نیا نیا شوق ہے۔" سہیل گھوڑا بڑھا کر آگے چلا
گیا اور جمال ریحانہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ریحانہ نے ہنس کر کہا "یہ دونوں
موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ کسی بہانے الگ آگے آگے جائیں۔ میں نے موقع
دے دیا۔"

جمال نے ہنس کر کہا "ہاں اپنا زمانہ یاد آگیا ہوگا۔"

ریحانہ مسکرائی "ہٹئے بھی۔"

سہیل نصرت کے قریب پہونچا تو وہ تنی ہوئی گھوڑے پر بیٹھی تھی چہرے
کا رنگ دھوپ اور محنت کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا اور سیاہ برقعہ کا ہالہ اس
کے چہرے کے گرد بہت پیارا لگ رہا تھا جیسے سیاہ بادلوں میں چاند۔ سہیل
نے مسکرا کر کہا "شہ سوار صاحب ذرا ادھر تو دیکھئے۔" نصرت نے جواب دیا
"اے مسافر ہماری راہ کھوٹی نہ کر۔" سہیل "اوہو یہ دماغ بڑی تنی ہوئی بیٹھی ہو
کہیں گر نہ پڑنا۔" نصرت "میں کیوں گرنے لگی۔ تمھاری طرح اناڑی تھوڑا ہی
ہوں۔" سہیل زور سے قہقہہ مارا "اوہو کیا کہنے ہیں آپ کی مشاقی کے۔" نصرت
بھی ہنس پڑی۔ باتوں میں خیال نہ رہا اور بی نصرت کے گھوڑے کی زین کھلتے
کھلتے پیچھے دم تک پہنچ گئی۔ سہیل نے دیکھ لیا اور گھبرا کر پکارا "ارے ارے
سنبھلو" اور یہ کہتے کہتے گھوڑے سے کود پڑا کہ زین ٹھیک کر دے۔ نصرت
گھبرا کر اور پیچھے کو جو ہوئی تو دُم پر سے ہوتی ہوئی لڑھک گئی وہ تو سہیل

نے جھپٹ کر سنبھال لیا ورنہ خدا جانے کس کھڈ میں پڑی ہوتی کئی منٹ تک تو نصرت کے حواس ہی درست نہ ہوئے۔ سہیل اسے تسلی دیتا رہا گھبراؤ نہیں کوئی بات نہیں تھی۔ اتنے میں جمال اور ریحانہ بھی پہنچ گئے شہسوار صاحب کے گرنے کا حال سن کر خوب ہنسے۔ مگر اب نصرت دوبارہ گھوڑے پر بیٹھنے کے لئے راضی نہیں ہوتی اور گل مرگ تھا ابھی دو میل دور۔ مجبوراً سب نے پیدل چلنا شروع کیا مگر گل مرگ کی چڑھائی بھلا نصرت کے بس کی تھی آخر ہار کر پھر راضی ہونا پڑا اور ٹٹو پر بیٹھی لیکن اب ٹٹو والا لگام پکڑے ساتھ ساتھ تھا۔

سب نے دو دن بہت لطف سے گل مرگ میں گذارے۔ ریحانہ کے اصرار سے نصرت کھلن مرگ بھی گئی اور وہاں سے برف پر بھی چڑھی۔ سب نے خوب برف کھایا، گولے بنا بنا کر ایک دوسرے کے مارے وہیں ناشتہ کیا، نمازیں پڑھیں اور پھر گل مرگ واپس آ گئے اور تین دن بعد واپس سری نگر پہنچے۔

اسی طرح دو ہفتے سہیل اور نصرت نے انتہائی لطف اور مسرت سے کشمیر میں بسر کئے۔ پہل گام کی وادی دیکھی، چندن واڑی اور آڑو کی چڑھائیاں چڑھیں۔ اچھابل کے باغ کی سیر کی۔ کُکرناگ کا ہاضم اور مزیدار پانی پیا۔ دادی لولاب گئے اور ولر میں کشتی کی سیر کی، مانس بل کی جھیل کے حسین کنول اور دریا نظارہ دیکھا۔ غرض خوب ہی کشمیر کی سیر سے لطف اٹھایا۔ دونوں میاں بیوی ایک جان دو قالب معلوم ہوتے تھے اور اس

یک دلی اور یک جہتی کی وجہ ہی سے انھیں کشمیر میں جنت کا سا لطف آرہا تھا۔ ابھی تک دونوں ایک دوسرے کو ہر عیب سے بری اور فرشتہ صفت سمجھتے تھے کمزوریوں اور برائیوں پر نظر ہی نہ جاتی تھی۔

نصرت اور سہیل کے عزیزوں کے خط پر خط آتے رہے کہ بس اب آجاؤ مگر یہ دونوں ٹس سے مس نہ ہوتے۔ لیکن کہاں تک۔ آخر ڈھائی مہینے بعد بادل ناخواستہ جانے کا ارادہ کرنا ہی پڑا نصرت اور ریحانہ میں دلی محبت ہوگئی تھی۔ انھیں ایک دوسرے کو چھوڑتے ہوتے واقعی بہت رنج ہوا بہت سے عہد و پیمان محبت کے برقرار رکھنے کے لئے اور بہت سے تحائف کے تبادلہ اور خط و کتابت کے وعدے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئیں۔

کشمیر کے قیام میں سہیل نے کئی خوب صورت اور قیمتی چیزیں خرید کر تحفتاً نصرت کو دیں جس میں ایک خوبصورت شال، ایک پیپر ماشی کا لیمپ اور ایک چاندی کا پاندان سب سے زیادہ خوبصورت اور قیمتی تھے۔ نصرت نے بھی سہیل کو چاندی کا خوبصورت سیگرٹ کیس اور لکڑی کا نہایت عمدہ بک ریک تحفہ میں دیا جس سے سہیل بہت ہی خوش ہوا۔ اس کے علاوہ دونوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لئے بہت سے تحائف خریدے اور لدے پھندے اگست کے دوسرے ہفتہ میں یہ دونوں واپس اپنے وطن پہنچ گئے۔ نصرت چند دن کے لئے میکے چلی گئی اور سہیل اپنی نوکری کی کوشش میں لگ گئے۔

(۳)

نصرت ماں بہنوں کی ہمیشہ سے لاڈلی تھی اس لئے بچپن سے نازک مزاج اور ہٹیلی ہو گئی تھی۔ شادی ہوئی تو میاں نے حد سے زیادہ ناز برداریاں کیں اور بقول شخصے چھ مہینے تک تو پھولوں ہی میں تولتا رہا اس سے نصرت اور بھی کاہل اور پہلے سے بھی زیادہ نازک مزاج اور ضدی ہو گئی بات بات میں تنک مزاجی کرتی اور اپنی ہر بات منواتی لیکن سہیل اسے ناز معشوقانہ اور الھڑ پنے کی دل کش ضد سمجھ کر بخوشی برداشت کرتا رہا اور ناتجربہ کار نصرت نے اپنے دل میں یہ سمجھ لیا کہ ہمیشہ اسی طرح گزرے گی۔

چھ مہینے بعد سہیل کو کانپور میں کسی مل میں نوکری مل گئی۔ چونکہ سہیل کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور بہنیں اپنے اپنے گھر کی تھیں اس لئے اسے نصرت کو تنہا ہی ساتھ لے جانا پڑا۔

نصرت کو گھرداری کا کچھ تجربہ نہ تھا اس لئے بہت مشکل پڑی اور گھر کا انتظام سہیل کی خاطر خواہ نہ ہوا پہلے تو سہیل نے کوئی پروا نہ کی لیکن آخرکار اسے بہت سی باتیں محسوس ہونے لگیں۔ کھانے کا مزہ اچھا نہیں، گھر کی صفائی ٹھیک نہیں ہوتی۔ اس کے ملنے جلنے والے آتے ہیں تو ان کی خاطر خواہ تواضع نہیں کی جاتی۔ شروع میں اس نے ہنسی ہنسی میں نصرت سے دو ایک باتیں کہیں جب اس نے اس پر بھی توجہ نہ کی تو سنجیدگی سے سمجھایا جو نصرت کو بہت ناگوار گزرا اور وہ خوب روئی دو دن میاں سے بولی نہیں لیکن پھر صلح ہو گئی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ چند دن بعد پھر کسی ایسی ہی بات پر اس نے سختی سے

نصرت کو تنبیہہ کی۔ نصرت کو سچ مچ سخت رنج ہوا کہ یہی سہیل ہے جو میری دن
رات ناز برداری کرتا تھا اور ہر بات پر اس کا سر تسلیم خم رہتا تھا اس نے دن
بھر نہ کچھ کھایا نہ پیا منہ اوندھائے پڑی روتی رہی سہیل کو خود ہی اپنی سختی
پر افسوس ہوا اور شام کو اس نے معذرت کر کے بیوی کو منا لیا اور دونوں
نے سوچ سا چ کر یہ طے کیا کہ کسی منتظم عورت کو بلایا جائے جو نصرت کو گھر
داری کا انتظام سکھا سکے۔ نصرت نے اپنی بڑی بہن کو بلانے کی تجویز کی جو
عرصے سے بیوہ ہونے کی وجہ سے میکے میں رہتی تھیں سہیل نے بہ خوشی منظور
کر لیا اور دونوں نے انھیں بلانے کے لئے خط لکھے۔ اس کے علاوہ سہیل نے
اپنا ایک تجربہ کار بڈھا باورچی بھی بلا لیا۔ نزہت اور باورچی کے آنے کے
بعد گھر کا انتظام سنبھل گیا اور پھر دونوں میاں بیوی میں صلح رہنے لگی لیکن
یہ بھی عارضی ثابت ہوئی۔ ان دونوں کی طبیعت میں اتنا زیادہ اختلاف تو نہ
تھا۔ لیکن ضد اور اپنے اپنے اصول پر اڑ بیٹھنے کی عادت بہت تھی۔ نصرت
پرانے قسم کے لباس کو پسند کرتی۔ سہیل چاہتا نصرت ساڑھیاں اور فیشن ایبل
بلاؤس پہنے۔ معمولی ہندوستانی جوتیوں کے بجائے اونچی ایڑی کے سینڈل
استعمال کرے سینٹ اور پاؤڈر، لپ اسٹک، ور روژ استعمال کرے وہ ضع
وضع کی سنگار کی چیزیں لاتا، خوبصورت خوبصورت ساڑھیاں بلاؤس اور
جوتے لا کر دیتا۔ لیکن نصرت بے نیازی سے انھیں لے کر رکھ لیتی سہیل کو برا
لگتا کہ میری دی ہوئی چیز کو نصرت حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔ اگر نصرت
کبھی سہیل کی خاطر یہ چیزیں استعمال بھی کر لیتی تو نزہت ناک بھوں چڑھا کر اعتراض

کرتی. جس پر نصرت مظلومی سے کہتی "آپا کیا کروں ان کی زبردستی ہے مجھے خود یہ چیزیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔" اور نزہت ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیتی "خیر بیوی جو پڑی وہ بھگتو مگر دیکھو خبردار مذہبی معاملہ میں اس کا کہنا نہ ماننا چاہیے کچھ بھی ہو جائے" سہیل چاہتا نصرت نوکروں کے سامنے آجائے تاکہ گھر کے کام کاج میں آسانی ہو۔ لیکن نصرت کہتی "نوج آگ لگے ان موؤں کے منہ کو میں کیوں ان کے سامنے آنے لگی۔ چاہے کام ہو جائے نہ ہو پر مجھ سے یہ نہ ہوگا" سہیل کو ناگوار گزرتا مگر چپ رہتا ایک مرتبہ سہیل کے دو گہرے دوست لکھنو اور میرٹھ سے اس سے ملنے آئے۔ شادی سے پہلے ان تینوں میں یہ وعدہ تھا کہ سب کی بیویاں ایک دوسرے کے سامنے آئیں گی۔ ان دونوں کی بیویاں سہیل کے سامنے آتی بھی تھیں۔ اب جو یہ آئے تو سہیل سے سخت اصرار کہ اپنی بیگم صاحبہ سے ملاقات کراؤ۔ سہیل۔ نصرت کے خیالات سے واقف تھا کہ وہ پردے کی سخت سے پابند ہے اور اس سے بھی زیادہ ساس کی نکتہ چینی اور نصرت کو بہکانے سکھانے کی عادت سے ڈرتا تھا مگر دوستوں کے سامنے اپنی ہیٹی بھی کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی خوشامد اور چاپلوسی پیار اور محبت کے ساتھ بیوی سے درخواست کی کہ میرے ان دوستوں کے سامنے آجاؤ اور کسی کے سامنے کرنے پر اصرار نہیں کروں گا۔ مگر یہ میرے بھائیوں کے برابر ہیں لیکن نصرت نے صاف انکار کر دیا۔ جب سہیل کا اصرار زیادہ بڑھا تو تیوری چڑھا کر دو چار سخت سخت باتیں کہیں "نہ میں لامذہب نہ بے دین یہ یورپ کی نقالی اور بے شرمی تمہیں ہی مبارک رہے خبردار جو میرے سامنے اس

قسم کی باتیں کیں۔ سہیل نے ناراضگی سے کہا "یہ تمہارا مذہب تو عجیب ہے کتنے ہی دور کے عزیز ہوں کیسے ہی خراب چال چلن والے ہوں ان کے سامنے آنا جائز ان سے ہنسی مذاق بات چیت روا، ساری سسرال کے سامنے آنے میں کوئی عیب نہیں لیکن اگر میرے دو نہایت شریف اور نیک چلن دوستوں کے سامنے آجاؤ گی تو بس فوراً بے دین لا مذہب اور دوزخی ہو جاؤ گی" نصرت نے غصہ سے کہا بس بس میرے سامنے اس قسم کی باتیں نہ کرو میں مذہب کی توہین کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تم کیا جانو مذہب کیا چیز ہے نہ کبھی نماز نہ روزہ بڑے آئے مذہب پر اعتراض کرنے والے"۔ سہیل غصہ میں بھرا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ نصرت نے اپنی مظلومی کی داستان بہن کو سنائی جب پر انھوں نے خوب خوب بہنوئی کو برا بھلا کہا بہن کو پیار کیا اس کی "بدنصیبی" اور میاں کے "مظالم" پر صبر کرنے پر اظہار تعجب کیا اور کہا میرا میاں ایسا کرتا تو یوں کرتی ووں کرتی وغیرہ وغیرہ۔ نصرت کو اور بھی شہ ملی۔ دونوں بہنوں نے سہیل کے دوستوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ سہیل نے اگرچہ اپنے دوستوں سے یہ کہہ دیا کہ وہ ابھی شرماتی ہیں پھر کبھی سامنے آجائیں گی لیکن اسے شرمندگی بہت ہوئی کیوں کہ سب دوستوں میں زیادہ پردے کا مخالف وہی سمجھا جاتا تھا پھر بیوی اور سالی نے جو برتاؤ اس کے دوستوں کے ساتھ کیا کہ نہ کھانے کا خیال نہ ناشتے کا اور کام کیا بھی تو ناگواری اور بیزاری سے اس کا اسے بہت رنج ہوا۔ اس پر طرہ یہ کہ سالی نے بہنوئی کو بٹھا کر بہت سمجھایا اور ملامت کی کہ تم ایسی لامذہبی کی باتیں کرتے اور غریب لڑکی پر ظلم کرتے ہو یہ

تو اسے بہت ہی برا لگا اور دل میں بیوی کی طرف سے برائی بیٹھ گئی۔ کئی دن تو دونوں اکڑے رہے بات ہی نہیں کی۔ رفتہ رفتہ بات تو کرنے لگے مگر رکے رکے اور کھنچے کھنچے رہے دو ایک مہینے اور گزرے لیکن دونوں میں سے ایک کا دل بھی صاف نہیں تھا اور نہ یہ کرتے تھے کہ ایک دوسرے سے شکایتیں بیان کرکے دل کا غبار نکال لیں۔ اس عرصے میں نصرت کے باپ اور بھائی کا خط اسے بلانے کا آیا سہیل نے خاموشی سے جانے کی اجازت دے دی۔ نصرت بھی گھبرا گئی تھی اس خیال سے خوش ہوئی کہ چلو کچھ دن سب کے پاس رہ کر دل بہلائیں گے۔ سہیل کو اس کا خوش خوش جانا اور بھی کھلا اس نے سمجھا کہ نصرت کو میری ذرا سی نہ پروا ہے نہ محبت۔ غرض نصرت اور نزہت روانہ ہو گئیں اور سہیل اکیلے رہ گئے۔

(۴)

تین چار مہینے نصرت میکے میں رہی۔ شروع میں تو چند دن سہیلیوں اور عزیزوں میں خوب ہنسی خوشی گذارے لیکن آخر میاں کی یاد آنے لگی اور اس انتظار میں رہتی کہ کب میاں کے بلانے کا خط آتا ہے سہیل کے جو خط آتے وہ بالکل رسمی اور روکھے پھیکے۔ اب نصرت کو احساس ہوا کہ میں نے آپا کے اس کہنے پر کہ کبھی میاں سے دب کر نہ رہنا اور اس کا کہنا نہ ماننا، عمل کرکے غلطی کی۔ لیکن پھر اپنی مظلومی اور میاں کی زیادتی یاد آجاتی۔ نصرت کی بھاوج بہت سمجھ دار عورت تھی وہ خود اپنے میاں کی مرضی پر چلتی اور اس کا مزاج کا رخ دیکھا کرتی تھی اسے جب یہ اندازہ ہوا کہ نصرت اور سہیل میں کچھ خفگی

ہے تو اس نے نند کو سمجھایا لیکن نزہت نے فوراً بھاوج پر طعنہ مارا کہ تم اس کا رہنا نہیں چاہتی ہو۔ خود نصرت کو بھی برا لگا۔ بھاوج بچاری سمجھا کر چور سی ہو گئی مگر اس پر بھی اس نے چپکے سے یہ تحریک کی کہ سہیل نصرت کو بلالے۔ سہیل چھٹیوں میں آئے تو بھاوج نے اصرار کر کے نندوئی کو بلایا بہت خاطر تواضع کی، بند بند، نند کی ناتجربہ کاری اور الھڑپنے کی معذرت بھی کی۔ سہیل خود بھی بیوی کو لے جانا چاہتے تھے چنانچہ انھوں نے نصرت سے چلنے کو کہا۔ نصرت راضی ہو گئی اور ہیں نصرت کو لے کر نوکری پر چلے گئے۔ اس مرتبہ نصرت اور سہیل دونوں نزہت کو لے جانا نہیں چاہتے تھے مگر وہ خود تیار ہو گئیں تو دونوں مروت کی وجہ سے انکار نہ کر سکے۔

گھر پہنچ کر چند دن تو صلح صفائی سے گزرے۔ نصرت بھی میاں کی خوشی کا خیال رکھتی۔ سہیل بھی اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ نزہت نے دیکھا کہ بہن کی ساری توجہ میاں کی طرف ہے اور میری پروا بھی نہیں رہی تو اس نے بہن کو پھر سکھانا پڑھانا شروع کر دیا۔ "مرد کی کبھی زیادہ ناز برداری نہیں کرنی چاہئے۔ ان کی بات ہی الٹی ہے جتنا چاہو اتنا ہی بے رخی کرتے ہیں اور جتنی بے رخی کرو اتنا ہی زیادہ چاہتے ہیں۔" "میرا اصول تو یہ ہے کہ کبھی میاں کی بات نہ مانے جو وہ کہے، اس کے برعکس ہی کرے تب ہی یہ مردوئے ٹھیک رہتے ہیں۔" "یہ بھی کوئی لباس ہے جب دیکھو نگوڑی بدوضع ساڑھی، جب دیکھو کٹی آستینوں کا پھنسا ہوا قمیص

یہ ادا تمھارے میاں کو بھاتی ہوگی۔ نگوڑا بے شرمی کا لباس۔ "یہ آخر پوڈر سرخی کیوں آیا کرتا ہے۔ موئے میں شراب ملی ہوتی ہے اس کے استعمال سے نہ نماز جائز نہ روزہ" سیدھی سادی اور بے سمجھ نصرت پر پھر ان باتوں کا اثر پڑنے لگا۔ دراصل اسے اپنی بہن سے بہت ہی محبت اور عقیدت تھی اور اس کی ہر بات کو آیت حدیث سمجھتی۔ سہیل نے جو یہ رنگ دیکھا تو اسے بہت ہی افسوس ہوا جب گھر میں آتے بیوی یا سالی کسی نہ کسی بات پر ناک منہ چڑھائے بیٹھی ہیں یا کسی کو برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ بیوی کے ہر دم تیوری پر بل، کپڑے میلے سر جھاڑ منہ پھاڑ۔ اس کا دل گھر سے اچاٹ ہونے لگا اور وہ زیادہ وقت اپنے دوستوں میں یا کلب وغیرہ میں گزارتا۔ سینما کا اسے بہت شوق تھا۔ شروع شروع میں اس نے نصرت کو بھی بہت سے فلم دکھائے تھے مگر جب سے سالی صاحبہ آئی تھیں انھوں نے اس پر بھی کفر کا فتوی لگا دیا تھا اور اب مہینوں میں کبھی ایک آدھ دفعہ سہیل کے سخت اصرار پر نصرت فلم دیکھنے جاتی اور وہ بھی ناگواری سے۔ سہیل نے اس سے کہنا ہی چھوڑ دیا اکیلا یا دوستوں کے ساتھ جاکر دیکھ آتا۔ سہیل کی گھر سے غیر حاضری اور راتوں کو ایک ایک بجے آنا نصرت کو بہت محسوس ہوا نزہت کو خبر ہوئی تو اس نے فوراً بہنوئی پر بدچلنی کا فتوی لگا دیا۔ نصرت کو اس پر یقین تو نہیں آیا مگر بہن کے سامنے تردید بھی نہیں کی۔ سہیل کی توجہ اور بھی بیوی کی طرف کم ہونے لگی گھر میں آتا بھی تو خاموش اور اداس سا رہتا۔ نصرت بھی اکڑی رہتی۔ بہن سے کہتی "میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ خوشامد کروں۔ انھیں میری پروا نہیں تو مجھے بھی ان کی نہیں۔" اسی طرح آپس میں خلیج

حائل ہوتی رہی۔ دل ہی دل میں شکایتیں پیدا ہوتیں مگر ایک دوسرے کو
ان کی خبر نہ ہوتی۔

ایک دن سہیل دفتر سے گھر آئے خلاف معمول آج طبیعت بشاش تھی
آتے ہی بیوی کو پکارا "نصرت یہاں آؤ" نصرت بہن کے پاس بیٹھی پان کھا
رہی تھی میاں کی آواز سن کر اس کے پاس چلی گئی۔ سہیل نے مسکرا کر کہا "نصرت
جلدی سے چائے پلا دو پھر دونوں ایک جگہ چلیں گے" نصرت نے کہا
"کہاں جانا ہے" "پہلے چائے منگاؤ پھر بتائیں گے" نصرت نے کہا
"تو چلو وہیں آپا کے ساتھ چائے پئیں گے" سہیل التجا آمیز لہجے میں بولے
"نصرت معاف کرو آج تو میرا جی یہ چاہتا ہے کہ اکیلے ہم ہی دونوں مل کر
ناشتہ کریں" نصرت نے تیوری پر بل ڈالا "آپا بچاری آپ کو کیا کہتی ہیں؟" سہیل
نے کہا "کچھ نہیں کہتیں لیکن آخر میں بھی آدمی ہوں کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ اپنی
بیوی کے ساتھ اکیلے چائے پیوں، اکیلے سیر کو جاؤں تو اس میں کوئی گناہ
ہے" نصرت تیکی کے دم میں تھی۔ ماما سے چائے وہیں منگالی اور میاں کے
ساتھ پی۔ چائے پی کر سہیل نے کہا "نصرت آج یہاں نیا سنسار فلم آیا
ہے اس کی بہت شہرت اور تعریف ہے چلو اسے دیکھ آئیں" نصرت نے
بیزاری سے جواب دیا "آپ جائیے مجھے کوئی ایسی خواہش نہیں" سہیل نے
کہا "نصرت خدا کے لئے کبھی تو میرا کہنا مان لیا کرو جاؤ جا کر کپڑے بدل آؤ"
نصرت نے کہا "جانا ہی ہے تو کپڑے بدلنے کی کیا ضرورت ہے" سہیل
جھنجھلا کر بولا "نہ بدلو بلکہ تھوڑا سا میل کچیل اور لپیٹ لو اور آج میں اکیلے

ساڑھیوں اور سنگار بناؤ کی چیزوں کو ڈھیر کر کے آگ لگائے دیتا ہوں جب تم پہننا ہی نہیں چاہتیں تو جائیں بھاڑ میں۔ نصرت سہیل کو غصّے میں دیکھ کر سہم گئی "آپ تو اب بات بے بات خفا ہونے لگتے ہیں۔ بہت اچھا میں ابھی کپڑے بدلے لیتی ہوں۔" سہیل چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئے نصرت ان کے پاس گئی "ناراض نہ ہو جیئے آپ جو کپڑے کہیں پہن لوں۔" سہیل خوش ہو گئے خود جا کر الماری میں سے اپنی پسندیدہ ساڑھی اور اس کے ساتھ کا بلاؤس نکالا۔ اپنے ہاتھ سے بیوی کے بال بنائے پوڈر اور سرخی لگائی اور نصرت تیار ہو کر کھڑی ہوئی تو کہا "آج مجھے معلوم ہوا کہ یہ میری ہی نصرت ہے جو میری خوشی اور خواہش کو ہمیشہ مقدم رکھتی تھی۔" نصرت نے قدرے شرما کر سر جھکا لیا۔ سہیل نے زیور کا ایک سٹ نکال کر اسے پہنایا اور کہا "حمید صاحب اور ان کی بیوی بھی ہمارے ساتھ چلیں گے میں نے ایک بوکس رزرو کرا لیا ہے جلدی سے برقعہ اوڑھ لو انھیں لیتے ہوئے جانا ہوگا۔" نصرت کا رنگ فوراً بدل گیا "میں ان کے ساتھ تو نہیں بیٹھوں گی۔" سہیل نے سمجھایا "ان کے ساتھ نہیں ہم تو الگ کو بیٹھیں گے تم چلو تو سہی۔" نصرت بہت سے پاس یہ کہنے گئیں کہ میں ذرا باہر جا رہی ہوں تو انھوں نے بہن کے لباس اور سنگار پر نظر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔ نصرت چپ چاپ چلی آئی دونوں گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ حمید کے گھر سے ان دونوں میاں بیوی کو لیا۔ حمید کی بیوی نئے زمانے کی اور بے پردہ خاتون تھی لیکن نہایت خوش مزاج اور ہنس مکھ۔ نصرت کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ حمید صاحب

نے مذاق میں نصرت کے برقعہ اور نقاب پر دو ایک فقرے کسے برقعہ کو لفافہ
کہا۔ اور سہیل بھی دوست کا ساتھ دینے کے لئے ہنسنے لگا۔ نصرت کو بہت ناگوار
گذرا۔ سینما ہال میں جو بوکس رزرو ہوا تھا اس میں چار برابر برابر کرسیاں تھیں۔ بیچ
کی دونوں کرسیوں پر نصرت اور مسز حمید بیٹھ گئیں۔ اخلاقاً سہیل کو مسز حمید کے
برابر بیٹھنا پڑا اگرچہ وہ دل میں اپنی بیوی کی طبیعت سے ڈر رہا تھا اور نصرت
کے برابر کی خالی کرسی پر حمید صاحب۔ نصرت کا خون غصہ اور شرم سے کھول
رہا تھا اس نے پورے وقت نہ نقاب الٹی نہ ٹھیک طرح سینما دیکھا کرسی پر ایک
کونے میں بیٹھی جلتی رہی۔ مسز حمید، حمید اور سہیل خوب آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے
انٹرول میں چائے آئی تو وہ بھی نصرت نے نہیں پی بلکہ نہایت ترشروئی سے انکار
کر دیا جس پر سہیل کو شرمندگی ہوئی۔ فلم ختم ہونے کے بعد جب دونوں گھر پہنچے تو
دونوں کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ رات کو نوک جھونک ہوتی رہی نصرت کو غصہ
تھا کہ تم نے مجھے ایک غیر مرد کے برابر کیوں بٹھایا اور اس نے میرے پردے کا
اور میرا مذاق اڑایا اور تم اس کے ساتھ شامل ہو کر میری ہتک کرتے رہے
سہیل کہتا تھا تمھاری تنگ مزاجی اور بد مذاقی مجھے سب کے سامنے ذلیل اور
شرمندہ کرتی ہے۔ تم میزبان تھیں بجائے اس کے کہ دوسروں کی خاطر کرتیں
کم سے کم مسز حمید ہی سے اخلاق اور محبت سے باتیں کرتیں، منہ چڑھائے
بیٹھی رہیں۔ اس پر نصرت نے مسز حمید کے متعلق کہا کہ تم ایسی بے شرم عورتوں
پر جان دو مجھے نہیں اچھی لگتیں سہیل کو غصہ آیا اس نے بھی کچھ کہا اور رات
بھر جھگڑا ہوتا رہا۔ اگلے دن نزہت نے اور نمک مرچ چھڑکا لیکن ہفتے عشرے کے

اندر پھر معمولی بات جیت اور ظاہری صلح ہو گئی۔
کچھ دن بعد نصرت کے ایک رشتہ کے بھائی کانپور آئے۔ نصرت تو نہیں جانتی تھی مگر سہیل کو ان کی خراب عادات اطوار کا حال معلوم تھا۔ ان کا گھر میں ٹھیرنا اور نصرت سے ہنسی مذاق سہیل کو برا لگا۔ ایک دن باتوں میں اس نے نصرت سے اس کا ذکر کیا۔ نصرت کو ناگوار گذرا کہ میرے عزیز کا رہنا تمھیں برا لگتا ہے اس پر سہیل نے طعنہ مارا کہ میرے شریف دوستوں کے سامنے آتے تو شرم آتی ہے اور اس بدمعاش کے سامنے کس بے تکلفی سے آتی ہو۔ اس پر بات بڑھ گئی اور دونوں میں پھر لڑائی ہو گئی۔
غرض کئی مہینے اس طرح گزر گئے مہینے میں ایک آدھ مرتبہ لڑائی ضرور ہوتی سہیل سمجھتا تھا کہ نصرت میری کسی خواہش اور خوشی کو پورا کرنا نہیں چاہتی جو کہتا ہوں اس کے خلاف کرتی ہے۔ نوکروں اور میرے دوستوں سے سخت پردا، میرے دوستوں کی بیویوں سے بے رخی اور اپنی سہیلیوں اور ملنے جلنے والیوں کی خاطر مدارات وغیرہ سب کچھ نصرت کو صدمہ تھا کہ اب تو سہیل کا کسی وقت مزاج ہی نہیں ملتا۔ بات کریں گے تو الٹی پلٹی۔ راتوں کو ایک ایک بجے تک باہر رہتے ہیں۔ میری ہر بات انھیں گنواری اور جاہلانہ نظر آتی ہے ہائے یہ وہی سہیل ہے جو میری ہر ادا پر جان دیتا تھا۔
چھوٹی چھوٹی باتوں سے نااتفاقی بڑھتی رہی۔ نزہت نصرت کو شہ دیتی کہ ہرگز سہیل سے دب کر نہ رہے ادھر سہیل کو یہ ضد کہ اگر نصرت میری

خوشی کا خیال اور میری پروا نہیں کرتی تو میں بھی اس کی پروا اور محبت چھوڑ دوں گا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اکڑے ہوئے تھے۔ ایک دن کسی بہت ہی معمولی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ شاید چائے میں دیر ہو گئی تھی اس پر سہیل نے بہت ناگواری سے کہا کہ کیا اب یہاں چائے اور کھانا بھی چھوڑ دوں کہیں اور منہ کالا کروں اسی پر نصرت نے غصہ سے جواب دیا کہ وہ تو تم چاہتے ہی ہو میری تمھیں پروا ہی کون سی ہے بات بڑھتی گئی دونوں میں خوب لڑائی ہوئی اور نصرت نے میکے جانے کی دھمکی دی۔ سہیل نے کہا "یہاں ہی کون تم مجھے آرام پہنچاتی ہو۔ جہاں جی چاہے جاؤ تمھیں میری پروا کب ہے" اب تو نصرت آئیں تو جائیں کہاں؟ دونوں بہنوں نے رو رو کر خون کر لیا۔ نصرت نے اپنا سب سامان باندھا اور بغیر سہیل سے ملے نوکر کو ساتھ لے کر چلی گئیں سہیل کو سخت صدمہ ہوا اور اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ اس کے چچازاد بھائی کو جب یہ سن گن ملی تو انھوں نے خیال بٹانے کے لئے چھٹی دلوا کر شملے بلا لیا اور سہیل چند دن کے لئے غم غلط کرنے کے لئے وہاں روانہ ہو گیا۔

(۴)

نصرت بہن کے پاس میکے آئی تو سخت غصے کی حالت میں تھی۔ اگر کوئی سہیل کا نام بھی اس کے سامنے لے دیتا تو تیوری چڑھ جاتی، منہ پھول جاتا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ اس کے والد تو نہایت خاموش طبیعت کے آدمی تھے جنھیں خاندان کے جھگڑے بکھیڑوں سے کوئی واسطہ

ہی نہ تھا۔ لیکن بھائی بھاوج دونوں نے نزہت سے بہن بہنوئی کی نااتفاقی
اور سہیل کے مظالم کی داستان سنی تو انھیں سخت رنج ہوا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی
بڑی بہن کی فسادی طبیعت اور مبالغہ کی عادت سے واقف تھے اور چھوٹی
بہن کی تنگ مزاجی اور ہٹ دھرمی کو بھی خوب جانتے تھے اس لئے انھوں
نے سہیل کے "مظالم" کو دس پر تقسیم کر دیا۔ تب بھی انھیں اس بات کا بہت
افسوس تھا کہ ان دونوں میں پہلے اس قدر محبت تھی اور اب اتنی نااتفاقی
اور نفرت ہو گئی۔ نصرت کے بھائی نے بیوی سے کہا کہ نصرت کو سمجھانا تمھارا
فرض ہے۔ جوان لڑکی ہمیشہ کیسے باپ بھائی کے گھر بیٹھ سکتی ہے۔ اس نے
وعدہ تو کر لیا مگر نندوں کے مزاج سے بیچاری بہت ڈرتی تھی۔ کچھ دن بعد
جب اس نے سوچا کہ اب نصرت کا غصہ کچھ کم ہو گیا ہوگا تو بہت نرمی سے
نند کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن نصرت کو بہت برا لگا۔ خوب روئی دھوئی
کہ بھابی کیا آپ کو میرا یہاں رہنا بار ہے جو آپ مجھ سے اس ظالم اور
ناانصاف آدمی سے صلح کر لینے کو کہتی ہیں؟ بھاوج نے اپنی صفائی دی اور
ممکن تھا کہ نصرت پر کچھ اثر ہوتا کہ بی نزہت بیچ میں کود پڑیں اور بھاوج سے
خوب لڑیں "واہ بی واہ بجائے اس کے کہ لڑکی کے ٹوٹے ہوئے زخمی
دل پر پھاہا رکھو تم اور نمک مرچ چھڑکنے آئی ہو۔ تم پر اس کا رہنا کیوں
بار ہے وہ تمھارے میاں کی کمائی نہیں کھاتی کیا باپ کی جائیداد میں بیٹیوں
کا حق نہیں جو تم اس طرح انہیں دھتکارتی ہو۔" غرض بیچاری بھاوج چور
بن گئی۔ بھاوج نے کان پکڑا کہ آئندہ ان نندوں کے معاملے میں دخل

نہیں دوں گی۔ اور میاں سے بھی کہہ دیا کہ تم جانو اور تمہاری بہنیں۔ مجھے کیوں خواہ مخواہ بیچ میں برا بنواتے ہو۔ اس واقعے کے بعد سے بھاوج نے تو پھر دخل نہیں دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد خود ہی ردعمل ہونے لگا۔ نصرت جو پہلے سہیل کا ذکر سننا گوارا نہیں کرتی تھی اب اس کی باتیں کوئی کرتا ہوتا تو چپ چاپ بیٹھ کر سن لیتی۔ اس کی تصویریں جو کہیں کونوں یا الماریوں کے خانوں میں گرد سے اٹی اور مکڑی کے جالوں میں لپٹی پڑی تھیں صاف کر کے میز اور دیوار پر سجادی گئیں۔ سہیل کے پرانے خطوں کا صندوق جو مدت سے کس مپرسی کی حالت میں پڑا تھا پھر سے صاف ستھرا کر کے میز کے پاس رکھ دیا گیا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر سوچتی ہائے افسوس کیسے اچھے دن تھے کیا یہ وہی سہیل ہے؟ ہائے اللہ انھیں کیا ہو گیا وہ پہلے مجھ پر جان دیتے تھے اور اب صورت سے بیزار ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کو سہیل کی جدائی بری طرح کھلنے لگی۔ وہ فطرتاً حساس تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ عورت کی قدر و منزلت دنیا جب تک کرتی ہے جب تک وہ شوہر کی گھر کی ملکہ رہے۔ بیاہی بیٹی کو ماں باپ بھی مشکل اور ناگواری سے بھرتے ہیں۔ اب بھائی کے ہاں کی ذرا ذرا سی بات لسے ناگوار گذرتی کسی نوکر نے کام میں ذرا تساہل کیا یا کسی بچے نے ناسمجھی سے کوئی بات کہہ دی تو نصرت کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ سب میری ہتک کرتے اور مجھے ذلیل سمجھتے ہیں نزہت بھی جو بہن کے بدلے بہنوئی سے ہر وقت لڑنے کو تیار رہتی تھی اب بہن کی طرف سے بے رخی کرنے لگی تھی کوئی بات ہوتی تو جھڑک کر کہتی "بس بی تم رہنے دو تم کیا جانو ان باتوں کو"

ایک مرتبہ کہا "جس کی میاں سے نہ بنی اس کی بھلا کسی سے بن سکتی ہے"! نصرت غریب کو یہ باتیں تیر کی طرح لگتیں۔ اور وہ دل میں پچھتاتی کہ ہائے اللہ میاں کیوں میں اپنا گھر چھوڑ کر سب کی نظروں میں حقیر ہونے کو یہاں آئی تھی۔

ہر وقت کی کوفت اور سوچ نے نصرت کی صحت پر برا اثر ڈالا اور اس کو اکثر حرارت رہنے لگی۔ شام سے طبیعت گری گری اور بے چین رہتی ساری ساری رات جاگتے گذر جاتی بیماری نے اس کو اور زیادہ حساس بنا دیا۔ وہ راتوں کو سہیل کے پرانے خطوط نکال نکال کر پڑھتی اور آنسو بہاتی۔ اس نے سہیل کے پرانے خطوں کو تاریخ وار ترتیب دے کر ریشمی ربن سے باندھ کر رکھا۔ سہیل کے دیتے ہوئے کشمیری تحفے لڑائی کے بعد سے کہیں صندوق کے کونے میں پڑے تھے۔ ایک دن کپڑوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اس کو وہ خوب صورت کشمیری شال نظر پڑ گئی جو سہیل نے اس کے لئے خاص طور پر آڈر دے کر بنوائی تھی اس کے ایک کونے پر ریشم سے کڑھا ہوا تھا "عزیز ترین نصرت کو اس کے پریمی سہیل کا ادنیٰ تحفہ"۔ نصرت کی نظریں شال پر جم گئیں اور کشمیر کے قیام کے دن آنکھوں میں پھر گئے کہ کس کس طرح سہیل اس کی نازبرداری کرتا تھا اور وہ کیسی سہیل کے اشاروں پر چلتی اور اس کی ہر بات دل و جان سے مانتی تھی۔ گھنٹہ بھر تک وہ وہیں صندوق کے پاس سر جھکائے تین ساڑھے تین برس پہلے کی قابل رشک زندگی کے خیال میں محو رہی آخر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھی اور شال نہایت احتیاط سے تہہ کر کے الماری میں رکھی سہیل کا دیا ہوا ایپر باشی کا لیمپ ڈھونڈ کر نکالا۔ اس کی ڈوری اور بلب خراب

ہو گئے تھے ان کو بدلا اور لکھنے کی میز پر رکھ دیا۔ پاندان جو اس کے جہیز کی
چیزوں میں ملا ہوا پڑا تھا ڈھونڈا اس پر چاندی صاف کرنے کا پاؤڈر مل کر
صاف کیا۔ کتھا چونا چھالیہ، تمباکو وغیرہ ڈالا اور پلنگ کے پاس تپائی پر اسے
سجا دیا غرض سارے دن اس میں مصروف رہی لیکن شام کو معمول سے زیادہ
تیز بخار چڑھ آیا اور نصرت منہ لپیٹ کر پڑ گئی اور رات بھر اس سوچ میں
رہی کہ آخر کیا بات تھی جس نے ہم دونوں میں اس قدر نا اتفاقی پیدا کر دی۔
شروع شروع میں تو اسے سارا قصور سہیل کا معلوم ہوتا تھا لیکن اب اسے بار
بار اپنی غلطیاں بھی یاد آ رہی تھیں سہیل جو کہتا جو چاہتا میں اس کے برعکس کرتی
تھی۔ آخر کیوں؟ وہ مذہبی معاملے میں لڑتا تھا۔ پردہ چھوڑنے کو کہتا تھا۔ اچھا
خیر میں پردہ نہ چھوڑتی لیکن معمولی باتوں میں تو اس کا کہنا مانتی۔ اس کی مرضی
کے کپڑے پہننے میں کیا حرج تھا؟ اس کے ساتھ کھیل تماشوں میں جانے میں
کیا عیب تھا؟ اس کے دوستوں کی بیویوں کی خاطر مدارات کیوں نہیں کرتی
تھی؟ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں اسے یاد آتی تھیں اور بار بار خیال آتا
کہ اگر آپا میرے ساتھ نہ ہوتیں وہ مجھے ہر بات میں سہیل کی نافرمانی کرنے
کی ترغیب نہ دیتیں اور میری طرف داری نہ کرتیں تو ہرگز ہمارے تعلقات
خراب نہ ہوتے۔ اب اس کا جی چاہتا تھا کہ سہیل اسے منا کر لے جائے اور
وہ پھر سے خوشگوار زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ کیسے ہو؟ انہیں
تو معلوم ہوتا ہے میری پروا ہی نہیں رہی۔ چھ سات مہینے ہو گئے ایک خط
بھی نہیں بھیجا۔ اپنے گھر آتے تو ضرور ہوں گے مگر یہاں آکر جھانکا تک نہیں ہے

وہ کہیں کسی دوسری فکر میں تو نہیں ؟ یا اللہ پھر کیا کروں گی۔ کتنی مدت ہو گئی۔ ان کی خیریت معلوم نہیں ہوئی.......... بیچاری نصرت اس غم میں اور بھی گھلنے لگی مگر خودساختہ خودداری اور اپنی بات کی پچ عذر گناہ نہیں کرتے دیتی تھی۔ لیکن صدمے نے صحت خراب کر دی۔ باقاعدہ علاج ہو رہا تھا مگر فائدہ خاک بھی نہیں تھا۔ ایک دن اسے ریحانہ کی یاد آئی۔ مدت سے اسے خط نہیں لکھا تھا۔ ایک دن بیٹھ کر دس صفحے کا خط اسے لکھ مارا اور اپنی دکھ بھری حالت اور خراب صحت کا حال لکھنے کے بعد لکھا "تم سے ملنے کو بہت ہی چاہتا ہے کیسے ملاقات ہو؟" ایک ہفتہ بعد ریحانہ کا جواب آگیا "میں تمھاری بیماری سے پریشان ہوں اور یہاں کا موسم آج کل بہت اچھا ہے تم فوراً چلی آؤ تمھاری صحت پر اچھا اثر پڑے گا اور ملاقات بھی ہو جائے گی"۔ نصرت خود اس یکساں زندگی سے اکتا گئی تھی۔ باپ اور بھائی سے اجازت مانگی۔ انھوں نے اس کی صحت کے خیال سے خوشی سے اجازت دے دی۔ نزہت نے ساتھ جانا چاہا مگر بھائی نے روک لیا۔ اور پندرہ دن کی چھٹی لے کر خود جا کر نصرت کو کشمیر پہنچا آیا۔

(۵)

سہیل اپنے بھائی کے پاس سے مہینہ بھر بعد واپس آئے تو انھیں گھر ویران ویران اور اجڑا اجڑا نظر آیا۔ وہ فرصت کا زیادہ وقت دوستوں اور کلب میں گزارتے۔ پھر بھی جب گھر آتے تو طبیعت اداس ہو جاتی کھانا وغیرہ باورچی اچھا خاصا دیتا تھا۔ نوکر صفائی بھی کر لیتے مگر

سہیل کو ہر چیز میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی اور ساتھ ہی غصہ آجاتا کہ میں نے
نصرت جیسی بدمزاج زبان دراز اور خود سر لڑکی سے شادی کی ہی کیوں؟ اسی
بہت سوچ بچار کے بعد بھی نا اتفاقی اور لڑائی میں اپنا قصور نظر نہیں آتا
تھا سراپا ملزم نصرت ہی معلوم ہوتی تھی   تین مہینے اسی حالت میں گذر
گئے۔ دوستوں میں سے اگر کوئی اس کی بیوی کا ذکر چھیڑتا یا بلانے کا مشورہ
دیتا تو سہیل اسے وہیں روک دیتا براہ مہربانی ان کا ذکر نہ کرو سہیل کی بڑی
بہن کو جب بھائی بھاوج کی نا اتفاقی کا حال معلوم ہوا تو اسے بہت ہی
رنج ہوا وہ پہلے اس انتظار میں رہی کہ بھائی یا بھاوج کچھ لکھیں گے
مگر دونوں میں سے ایک نے بھی اسے کچھ نہ لکھا آخر سلمہ بغیر کہے ایک دن
سہیل کے ہاں اپنے دونوں بچوں سمیت آگئی سہیل کو بہن سے ملے بہت
دن ہوگئے تھے بہت خوش ہوا بڑی خاطر مدارات کی لیکن اس کے دل
میں رہ رہ کر یہ بات کھٹکتی کہ کاش نصرت ڈھنگ کی عورت ہوتی میری بہن
پہلی مرتبہ میرے ہاں آئی ہیں وہ یہاں ہوتی ان کی خاطر خواہ آؤ بھگت
کرتی۔ ان کا بھی جی خوش ہوتا اور میرا بھی۔ مگر میری بدقسمتی کہ ایسی
بیوی ملی۔

سلمہ نے چند دن تو کوئی ذکر نہیں چھیڑا کہ شاید بھائی خود ہی کچھ
کہیں لیکن جب اس نے نصرت کا نام بھی نہ لیا تو خود سلمہ ہی نے کہا "بھیا
کتنے مہینے دلہن کو گئے ہوگئے اب بلوالو نا" بھیا نے تیوری پر بل ڈال لئے
اور خاموش اخبار پڑھتے رہے۔ سلمہ نے پھر کہا "سہیل سنتے نہیں میں کیا کہہ

رہی ہوں۔ دلہن کے بغیر یہ گھر بہت برا لگتا ہے۔ میرا جی بھی نہیں لگتا۔ انہیں
بلاؤ نا۔" سہیل نے ایک معلوم سی آہ بھری "باجی اگر آپ دلہن کی موجودگی
میں آتیں تو یہ گھر آپ کو عجائب خانہ معلوم ہوتا۔" "کیوں آخر؟ کیا کہہ رہے ہو؟"
"کیا کہوں باجی۔ میری تو یہ عادت ہی نہیں کہ اپنی قسمت کا دکھڑا ایک ایک کے
آگے روؤں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ لوگوں نے بغیر نصرت کے مزاج کی
اچھی طرح تحقیق کئے اور یہ دیکھے کہ میری اور اس کی طبیعت میں کچھ مناسبت
ہے یا نہیں شادی کر دی۔ قصور تو ظاہر ہے کہ ہر ایک میرا ہی بتاسے گا۔
مگر آپ ہی کہئے میں کیا کروں۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ میری تھوڑی بہت
ہم خیال ہو جائے پر اسے تو جیسے ضد ہے کہ ہر بات الٹی کرتی ہے۔" سلمہ
نے کرید کرید کر بھائی سے سب باتیں پوچھیں کہ آخر کس کس بات پر جھگڑا
ہوتا تھا اور اس وقت تو بھائی سے ہمدردی کرکے نصرت کو الزام دے کر
چپ ہو رہی۔ مگر دس پندرہ دن بعد سہیل اپنے ننھے بھانجے کو گود میں لئے
اس سے کھیل رہا تھا تو اس نے پھر ذکر چھیڑا۔ "بھیا اب غصہ تھوک کر دلہن
کو بلا لو ہمارا دل ایک ننھے سے بھتیجے بھتیجی کے لئے بے چین ہے۔ اللہ وہ دن
کرے کہ میں اس گھر میں بچوں کو کھیلتا دیکھوں۔" سہیل نے بات ٹالنے کو ہنس
کر کہا۔ "باجی وہ دن تو اللہ نے کر دیا ہے کھیل تو رہے ہیں۔" سلمہ نے کہا "اے
واہ ان کا کیا ہے یہ اپنے باپ دادا کی اولاد ہیں۔ میرا دل تو اپنے باپ
بھائی کی اولاد کے لئے تڑپتا ہے۔ خدا وہ دن کرے جو میں بھتیجہ کھلاؤں۔"
سہیل نے سنجیدگی سے جواب دیا "وہ دن تو شاید نہ آسکے۔" سلمہ نے جھڑک

کر کہا "اے اللہ نہ کرے بری فال منہ سے نکالتے ہو!" سہیل نے کہا "باجی آپ کیوں یہ ذکر چھیڑ کر میرے رنج کو تازہ کرتی ہیں۔ نصرت سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا!" سلمہ نے مسکرا کر کہا "تو پھر دوسری شادی کر لو" سہیل یہ سن کر بھڑک اٹھا "باجی آیندہ آپ اس قسم کی بات کبھی نہ کہئے گا دوسری شادی کی بھی خوب کہی ایک سے بہت چین اٹھایا جو دوسری کروں گا۔"

سلمہ۔ "تو وہ تم اپنی مرضی کے مطابق اپنی ہم خیال لڑکی سے کرنا۔"

سہیل۔ "معاف کیجئے میں ایسا ظالم اور پتھر دل کا نہیں ہوں کہ ایک غریب لڑکی پر سوت لا کر بٹھاؤں اور اس کا دل جلاؤں۔"

سلمہ۔ "جی اور یہ جو تم نے اسے میکے ڈال رکھا ہے بلاتے نہیں ہو اس سے تو وہ بہت خوش ہو گی۔"

سہیل۔ "نہ میں نے انھیں میکے ڈالا ہے اور نہ اس گھر میں آنے کو منع کیا ہے ان کا گھر ہے جب آئیں گی اس کا دروازہ ان کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔"

سلمہ۔ "تو پھر بلاتے کیوں نہیں۔ اچھا آج ہی خط لکھ دو۔"

سہیل۔ "جی یہ تو نہیں ہو سکتا وہ اپنی مرضی سے خود ہی لڑ جھگڑ کر گئی ہیں اب میں کیوں بلاؤں۔ اگر میں بھیجتا تو بلاتا بھی۔ وہ خود ہی گئی ہیں خود ہی آنا چاہیئے۔"

سلمہ۔ یہ خواہ مخواہ کی بات ہے وہ خود کیسے آ جائے۔

سہیل ۔ کیوں آ کیوں نہ جائے۔ خود چلی کیسے گئی تھیں۔
سلمہ ۔ تو میں جا کے لے آؤں۔
سہیل "نہیں ہرگز نہیں۔ میرا اور آپ کا جانا ایک ہی بات ہے۔ آخر ہم میں بھی کچھ خودداری کچھ اپنی عزت کا پاس ہے۔ اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی کر سکتی ہیں تو میں بھی اپنے اصول اور ارادے کا پکا ہوں۔
سلمہ ۔ اچھا بھیا تم ارادے کے اور اصول کے پکے سہی مگر اتنا مجھے بتا دو کہ تمھیں اب بھی نصرت سے محبت ہے یا واقعی اس سے نفرت ہو گئی ہے۔
سہیل ۔ نفرت ان سے تو نہیں ہاں ان کی عادتوں سے ضرور ہے۔
سلمہ ۔ تو صاف کہو کہ اب بھی میں اسے چاہتا ہوں۔ سہیل کے چہرے پر ایک عجیب رنگ آ گیا۔
سہیل "ہاں باجی چاہتا ہوں اور بہت چاہتا ہوں پر افسوس اس نے میری چاہت کی قدر نہ کی"
سلمہ ۔ یہ تم کیسے کہتے ہو سہیل۔ افسوس تم عورت کے دل کا حال نہیں جانتے مجھے یقین ہے کہ نصرت تمھاری یاد میں بے قرار اور صلح کرنے کے لئے بے چین ہو گی۔ مگر وہی جھوٹی خودداری اور احمقانہ اکڑ اس میں بھی ہے، جو معاف کرنا تم میں ہے۔ تم دونوں صلح کرنا چاہتے ہو پر پہل نہیں کرتے وہ۔ تو بیوقوف، ناتجربہ کار اور کم پڑھی

ہوئی لڑکی ہے اسے تو کیا کہوں پر مجھے تم پر افسوس ہوتا ہے کہ ماشاءاللہ اتنے عالم اور پڑھے لکھے ہو کر اس قدر سمجھ دار اور بردبار ہو کر تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اتنی محبت ہونے کے تم دونوں میں نا اتفاقی ہوئی کیسے؟ نصرت کا بھی قصور ہوگا اور غالباً زیادہ قصور اسی کا ہے لیکن بھیا تم بھی اس سے بَری نہیں۔ تم کہتے ہو کہ وہ میرے ایک بھی دوست کے سامنے نہیں آئی۔ نوکروں سے پردا نہیں توڑا میں نے خوشامد کی، سمجھایا سب کچھ کیا پر وہ اپنے اس جاہلانہ خیال پر اڑی رہی کہ یہ مذہب کے خلاف ہے اور میری خاطر اس نے اپنی مرضی کے خلاف اتنی سی بات بھی نہ مانی۔

سہیل۔ تو کیا میں غلط کہتا ہوں میں نے ان پر جبر تو نہیں کیا تھا سمجھا کر اور خوشامد سے کہا تھا۔ اس پر انھوں نے مجھے سخت سخت جواب دے دیئے، بگڑیں اور اپنی بہن سے شکایت کر کے مجھے سینکڑوں باتیں سنوائیں میں ادب کر گیا ورنہ ایسا منہ توڑ جواب دیتا کہ یاد رکھتیں۔

سلمہ۔ سہیل میاں تم نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ دلہن کی بہن کو بلا کر رکھا وہ تو اپنے میکے میں بھی بہت ضدی اور فسادی مشہور ہیں بے چاری کی کبھی اپنے میاں اور سسرال والوں سے نہیں نبھی۔ انھوں نے یہاں بہن اور بہنوئی میں نہ بننے دی۔"

سہیل "باجی نصرت چاہتی تو بہن بھلا کیا کرسکتی تھی"
سلمہ "مگر میاں تم نے کبھی یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ لڑکیوں کے دل میں ننھی سی عمر میں یہ خیال راسخ کیا جاتا ہے کہ مروّجہ پردے کی سختی میں ذرا سا فرق آنا سخت گناہ اور خدا کے غضب کا باعث ہوگا۔ اور بے پردہ عورتیں سب کی سب نہایت خراب ہوتی ہیں۔ مذہب کو ان کے بزرگ ہوّا بنا کر پیش کرتے ہیں جو ذرا ادھر سے ادھر ہونے پر کاٹ کھائے گا۔ جب اس قسم کے خیالات بچپن سے دل میں راسخ ہوں تو وہ کیسے ایک دم انھیں دل سے نکال سکتی ہے پھر نصرت ہمیشہ سے مذہب کی بہت پابند ہے۔ تمھیں چاہیئے تھا کہ آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے۔ رواجی مذہب اور رواجی پردے کی خامیوں سے آگاہ کرتے اور اسلام کی اصلی روح اور مقصد اور اسلامی پردے کی حقیقت اسے سمجھاتے اور جب اس پر تمھارے خیالات کا اثر پڑ چکتا تب اسے اپنے دوستوں کے سامنے ہونے یا نوکروں سے پردا توڑنے کو کہتے لیکن تم خود ہی مذہب اور مذہبی امور سے بےگانہ اور ناواقف ہو تم بھلا یہ کیا کرتے، بجائے اس کے تم نے یہ کیا کہ اس کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگائی جس سے وہ اور بھی چڑ گئی" سہیل خاموش رہا کچھ بولا نہیں سلمہ نے پھر کہنا شروع کیا "اور بھائی فرض کرو کہ وہ کبھی بھی تمھارے دوستوں

اور نوکروں کے سامنے نہ آتی تو آخر اس سے تمہاری گھریلو زندگی میں ایسا کون سا خاص فرق پڑ جاتا۔ میں تو نہیں سمجھتی کہ جن کی بیویاں ان کے دوستوں کے سامنے آتی ہیں وہ اپنی زندگی سے اور بیویوں سے ضرور ہی خوش اور مطمئن ہیں۔ بھیا ہم خیال میاں بیوی ہوں تو ان سے بڑھ کر دنیا میں کونسی نعمت ہو گی لیکن شاید ہزاروں میں سے ایک دو ایسے نکل آتے ہوں گے۔ خود ہی میاں بیوی کو ایک دوسرے کی مرضی کے مطابق بننا پڑتا ہے کچھ تم جھکو کچھ وہ جھکے انشاء اللہ رفتہ رفتہ ہم خیالی اور ہم مذاقی ہو جائے گی۔"

سہیل:۔ باجی پردے کو چھوڑیئے اور چھوٹی موٹی باتوں میں وہ میرا کون سا کہا کرتی تھیں۔ میں نے اپنے خیال میں اپنے سب فرائض اچھی طرح انجام دیئے اچھے سے اچھے زیور، کپڑے تحفے تحائف لا کر دیتا گھر بار نوکر چاکر روپیہ پیسہ سب ان کے ہاتھ اختیار رہتا تھا ان کو سیر و تفریح کو لے جانا چاہتا۔ جلسے، پارٹیوں میں اور سینما میں لے جانا چاہتا مگر وہ ہر بات پر ناک منہ چڑھاتی اور اگر کبھی کہا مان بھی لیتیں۔ تو مجھے الٹی کوفت اور بعض اوقات شرمندگی ہوتی تھی کپڑا میری مرضی کے مطابق پہننا گناہ، گھر میری خواہش کے مطابق سجانا منع، میں چاہتا شام کو آؤں میز کرسی لگی ہو، چائے مل کر پئیں مگر وہ اللہ کی بندی جب دیکھو پلنگ یا تخت پر چائے بلاتی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جن پر میں ان سے کچھ کہتا تو نہیں

تھا مگر جلتا تو تھا۔ آخر میں جھگڑے قصوں سے گھبرا کر باہر رہنے لگا تو اس پر ان کی بہن صاحبہ نے مجھ پر شرمناک الزام لگائے اور انھیں بھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ تردید کرتیں بلکہ الٹا منہ چڑھالیتی تھیں۔ آپ ہی بتائیے جب گھر میں اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں تو کس طرح انسان اس گھر میں خوش رہ سکتا ہے اور پھر مجھ جیسا شخص جو جھگڑے قصے سے کوسوں بھاگتا ہے پھر بھی سب میرا ہی قصور بتاتے ہیں!"

سلمہ۔ یہ میں جانتی ہوں کہ قصور نصرت کا ہے لیکن اس میں زیادہ حصہ نزہت کا ہوگا۔ اب اتنے دن الگ رہ کر اسے ضرور احساس ہوا ہوگا مجھے یہ یقین ہے کہ اب تم صلح کر لو تو ضرور وہ تمھاری خوشی کا خیال رکھے گی اور بھائی تمھیں بھی چاہیے کہ جو شکایت ہو صاف صاف کہا کرو اور اسے سمجھایا کرو کہ میں ایسا چاہتا ہوں ممکن ہے دو چار مرتبہ اسے برا لگے مگر ذرا سی بھی عقل ہوگی تو وہ خود اس کے فائدے سمجھ جائے گی۔ ایک دوسرے سے جب تک اپنی شکایتیں نہ کہی جائیں اور دل صاف نہ کر لیا جائے زندگی خوشی سے نہیں گزر سکتی۔ بھائی برا نہ ماننا میں تمھارے ہی بھلے کو کہہ رہی ہوں۔

سہیل نے کہا "نہیں باجی میں آپ کے کہنے کا برا کیوں ماننے لگا!"

"تو جو کچھ میں نے کہا ہے ذرا اس پر غور بھی کرنا۔ میرے بھائی

خیال دل سے نکال دو کہ نصرت کو تم سے نفرت ہے۔ یہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ ایک مرتبہ کسی سے محبت کر کے اس سے نفرت کر سکے اور وہ بھی اپنے شوہر سے۔ میں نے سنا ہے کہ نصرت کئی مہینے سے بیمار ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اسی رنج میں کڑھ رہی ہے۔"

"ہیں بیمار ہے؟ کیا بیمار ہے؟"

"تفصیل تو مجھے نہیں معلوم مگر یہ سنا تھا کہ طبیعت خراب رہتی ہے ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے۔"

سہیل خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور کئی دن تک بہن کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ نصرت کی بیماری کا حال سن کر اس کو بہت پریشانی ہو گئی تھی ایک دن وہ اپنے کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ نصرت کے خط نظر پڑ گئے دیر تک انھیں پڑھتا اور کچھ سوچتا رہا اور رات کو بستر پر لیٹا تو نصرت کا دیا ہوا چاندی کا سگریٹ کیس اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں نمی۔

صبح کو اس نے بہن سے کہا آپ نصرت یا ان کی بھاوج کو لکھ کر نصرت کی خیریت دریافت کیجئے۔ سلمہ نے خط لکھا تو آٹھ دس دن بعد نصرت کی بھاوج کا جواب آیا "نصرت کو تین مہینے سے بخار آ رہا تھا اس کے بھائی اسے کشمیر پہنچا آتے ہیں۔" خط سہیل کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کا چہرہ اس وقت زرد ہو رہا تھا۔

(۶)

ریحانہ نے نصرت کو دیکھا تو حیرت میں رہ گئی۔ تندرستی اور خوبصورتی کا دلکش مجسمہ اب ہڈیوں کا پنجر اور پھول کی طرح شگفتہ لڑکی اب افسردہ اور مرجھائی ہوئی ادھیڑ سی عورت معلوم ہوتی تھی۔ نصرت کے خانگی حالات کا کچھ اندازہ تو سلسے اس کے خطوں سے ہو گیا تھا۔ کچھ نصرت کے بھائی نے ریحانہ کو بتائے اور اصرار کیا کہ نصرت کو سمجھائے۔ وہ اندر ہی اندر غم میں گھل رہی ہے مگر اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑتی۔ ریحانہ نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں ضرور نصرت کو راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گی۔ نصرت کے بھائی نے سری نگر کے ایک مشہور ڈاکٹر کو دکھا کر اس کا علاج شروع کرایا اور بہن کو بہت تسلی تشفی دی کہ میں تمھاری صحت بحال ہوتے ہی آ کر لے جاؤں گا اور دس دن رہ کر واپس چلے گئے دو ہفتے تک ریحانہ نے نصرت کے اس کے شوہر اور گھر کے متعلق کوئی بات نہیں کی بلکہ اس کی صحت کی بحالی کی کوشش میں مصروف رہی۔ طاقت بخش غذا، ٹانک وغیرہ کا استعمال۔ کھلی ہوا میں سیر اور نہایت محبت اور دل سوزی سے تیمارداری ہوئی۔ پندرہ بیس دن کے اندر ہی نصرت کی صحت میں نمایاں فرق نظر آنے لگا۔ گالوں پر خفیف سی سرخی بھی آ گئی حرارت بھی صرف کسی کسی دن ہو جاتی طبیعت بھی پہلے سے بحال رہنے لگی۔ جب اس کی صحت بہتر ہو گئی تو ریحانہ نے باتوں باتوں میں سہیل کا حال پوچھا۔ نصرت نے پہلے تو رک رک کر تھوڑا بہت کہا۔ ریحانہ نے

اصرار نہ کیا کہ وہ تفصیل سے بتائے لیکن نصرت دراصل خود ہی بے قرار تھی
کہ کسی سچے ہمدرد اور غم گسار کو اپنا دردِ دل سنائے دو ایک دن بعد اس
نے خود ہی ریحانہ کو سب کچھ بتا دیا قدرتاً اس کے بیان میں سہیل پر الزام
زیادہ تھا اور اپنے کو بے قصور ثابت کرنا چاہا تھا۔ لیکن ریحانہ نے اندازہ
کر لیا کہ نصرت اپنے برتاؤ پر نادم ہے اور صلح کر لینا چاہتی ہے۔ اس نے
سمجھا اس وقت لوہا گرم ہے چوٹ پڑے گی تو کام ضرور کرے گی۔ ریحانہ
نے پہلے تو نصرت کی ہمدردی میں سہیل کو برا بھلا کہنا شروع کیا جس پر نصرت
نے کہا "ان کا بھی کوئی خاص قصور نہیں میری قسمت ہی خراب ہے دراصل
انھیں کوئی فیشن ایبل نئے زمانے کی بے پردہ لڑکی چاہیے تھی مجھ جیسی قدامت
پسند سے وہ خوش رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی
دوستوں کے سامنے آئے نوکروں سے پردہ توڑ دے فیشن ایبل لیڈی بنی
رہے اور مجھے ٹھیری ان سب باتوں سے نفرت" ریحانہ نے پوچھا
"کیا وہ ہمیشہ اس بات پر مصر رہتے تھے کہ میرے دوستوں اور نوکروں
کے سامنے آؤ"

نصرت۔ "نہیں انھوں نے کہا تو دو چار ہی مرتبہ لیکن انھیں مجھ سے نفرت
اسی وجہ سے ہوئی"

ریحانہ۔ "یہ خواہ مخواہ کی بدگمانی ہے۔ جب تم خود کہتی ہو کہ اس کے علاوہ
بھی بہت سی باتیں ان کی مرضی کے خلاف ہوتی تھیں تو محض پردے
ہی کو کیوں لیتی ہو۔ پردے کو چھوڑ کر دوسری باتیں تمھیں ان کی

مرضی کے مطابق کرنے میں کیا بات مانع تھی " نصرت نے افسوس سے کہا "میری بدقسمتی بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی تھی بس زرا زرا سی بات بڑھ جاتی تھی۔ وہ کہتے سینما چلو، میں کہتی کیا ضرورت ہے تم خود ہی چلے جاؤ، جو ساڑھی میں لایا تھا وہ کیوں نہیں پہنی گھر میں پہن کر کیا ہوگا پہن لوں گی جب موقع ہوگا۔ آخر چائے میرے ساتھ پی لیا کرو تو کچھ حرج ہے، بس یہی چھوٹی موٹی باتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اگر میں کچھ کرنا بھی چاہتی تو آپا کے لحاظ کے مارے نہیں کرتی تھی وہ سمجھتے لے میرا خیال نہیں، مجھ سے محبت نہیں اور جب وہ باہر رہنے لگے گھر میں رہنا کم کر دیا تب تو وہی میرا اپنا مزاج بہت ہی خراب رہنے لگا اور اسی پر زیادہ جھگڑا ہوا "

ریحانہ۔ جب تم ان کی مرضی کے خلاف کرو گی، لڑائی جھگڑا کرتی رہو گی تو وہ آپ ہی باہر رہیں گے۔ قصور اپنا اور لڑو گی ان سے واہ واہ۔ میری بہن چھوٹی چھوٹی باتیں بڑھ کر فساد کا تنا ور درخت بن جاتا ہے کاش تم نے سوچا ہوتا کہ اس قسم کی باتوں کی وجہ سے اپنا گھر برباد کر لینا کتنی بڑی حماقت ہے۔

نصرت۔ فرض کیجیے کہ میں ان کا ہر کہنا مان لوں لیکن پردہ کیسے چھوڑ دوں دنیا تو خراب ہو چکی عاقبت بھی خراب کر کے گنہگار ہوں "

ریحانہ ۔بس یہی تو بے وقوفی ہے تمہاری۔ مذہب مٹی کا کمزور پیالہ نہیں کہ

زرا سی ٹھیس ہی میں ٹوٹ جائے نہ اعمال و افعال کا جانچنے والا پروردگار ہمارے نام کے مولویوں اور پرانے زمانے کی بوڑھیوں کی طرح سخت گیر اور متعصب ہے کہ زرا کوئی بات اِدھر سے اُدھر ہوئی اور اس نے جہنم میں جھونکا۔

نصرت آپا۔ تو تم خوب باتیں کرتی ہو۔ مذہب بہر حال مذہب ہے اور اس کی پابندی لازمی ہے۔ اے بہن یہ دنیا چند روزہ ہے یہ زندگی تو گزر ہی جائے گی لیکن عاقبت خراب کرنا تو ٹھیک نہیں۔ جب پردے کا حکم ہے تو کیسے نہ کیا جائے۔

ریحانہ۔ اول تو آپ یہ ثابت کیجئے کہ پردے کا وہی حکم خدا رسول کا دیا ہوا ہے جو ہمارے مولویوں نے اور ہندوستانی سماج نے گھڑلیا ہے۔ پھر اگر ان کا کہنا ہی لو تو کتنے آدمی ہیں جن کے سامنے آنے کا حکم ہے۔ باپ، بھائی، بیٹا، دادا، نانا، خسر، ماموں، چچا وغیرہ بس ایسے ہی قریب کے دو چار اور رشتہ دار۔ مگر ہمارے ہاں سینکڑوں رشتے کے بھائیوں، چچاؤں، ماموؤں، بہنوئیوں وغیرہ وغیرہ کے سامنے آتے ہیں بس سسرال کے دور دور کے رشتہ داروں سے پردہ توڑا جاتا ہے اس سے تو مذہب کے حکم کے خلاف ورزی نہیں ہوتی لیکن اگر شوہر کے دو ایک دوستوں یا ایک آدھ نوکر کے سامنے آجائیں اور وہ بھی اپنی کسی خواہش سے نہیں بلکہ شوہر کی خوشی کی خاطر اور اپنا گھر بگڑنے سے بچانے کے لئے، تو خدا ناراض

ہوگا۔ مذہب کی خلاف ورزی ہوگی اور چنیں اور چناں۔ بھائی میں تو ایسے مذہب کی قائل نہیں۔ میرا تو مذہب یہ ہے کہ دل پاک و صاف ہونا چاہیئے۔

نصرت کچھ دیر سوچ میں غرق رہی اور پھر بولی "تمہاری بات کچھ کچھ دل کو لگتی تو ہے"۔ ریحانہ اسی رو میں کہتی رہی "پھر یہ تو سوچو گناہ تو سب ہی برے ہیں۔ عورتیں ایک دوسرے کی غیبت کریں حق تلفی کریں شوہر کی برائیوں کا ہر ایک سے رونا روئیں۔ اپنا مزاج خراب کرکے اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کردیں۔ دوسروں کا دل دکھائیں یہ سب روا اور ثواب اور اگر شوہر کا کہنا مان کر اپنے گھر کی زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے کوئی خاص لباس پہن لیا جائے، کسی خاص طرح سے سنگار کرلیں یا دو چار سے پردہ توڑ دیں تو فوراً دوزخ کا دروازے کھل جائیں گے مان لیا کہ یہ گناہ ہے لیکن میاں کا دل دکھانا، سب سے جھگڑنا اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی خراب کرنا اور اسی قسم کے دوسرے نتائج جو نااتفاقی سے پیدا ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر گناہ ہیں"۔

نصرت سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔

ریحانہ "میں ہرگز نہیں کہتی کہ تمہیں قصور وار نہیں میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ ان مردوں کو بیویوں کو دوستوں کے سامنے کرکے کیا مل جاتا ہے اگر بیوی مان لے تو خیر لیکن اگر وہ نہیں مانتی تو اس خیال کو بھاڑ میں ڈالیں۔ اس وجہ سے اپنی اچھی بھلی جان کیوں آفت میں ڈالی

جائے۔ مگر حماقت اور کیا۔ مگر یہ ضرور کہوں گی مرد سے نباہ کرنا اور زندگی ہنسی خوشی گزارنے کی ذمہ داری عورت پر ہے وہ چاہے تو تھوڑا سا اپنے پر جبر کر کے اس کا تھوڑا سا کہنا مان کر تھوڑا سا اپنا کہنا منوا کر اسی زندگی کو جنت بنا سکتی ہے اور ذرا ذرا سی بات کو بڑھا کر دنیا میں دوزخ کا مزہ بھی چکھا سکتی ہے۔ برا مانو یا بھلا، میں تو تمھیں الزام دوں گی۔

نصرت کی روتے روتے ہچکی بندھی ہوئی تھی اس نے سسکتے ہوئے کہا "اب کیا ہوتا ہے میں تمھارے کہنے پر عمل بھی کرنا چاہوں تو کر سکتی ہوں۔ انھوں نے سال بھر کے قریب ہوگیا نہ کوئی خط لکھا نہ جھوٹوں بلایا۔ کیا میری بیماری کی خبر نہ ہوتی ہوگی۔ مگر انھیں اب میری پروا ہی کیا ہے۔ انھیں تو مجھ سے دلی نفرت ہے۔ خیر میری زندگی ہے کے دن کی، کچھ دن میں ختم ہو جاؤں گی۔"

ریحانہ نے اسے گلے لگا کر کہا "یہی تو تمھاری حماقت ہے مجھے یقین ہے کہ سہیل اب بھی تمھارا اسی طرح عاشق زار ہے۔ جیسی تمھاری اکڑ ہے ایسی ہی انھیں بھی ہوگی۔ تمھارا میل کرانا میرا ذمہ۔ یہ وعدہ کرو کہ اب کی مرتبہ پوری کوشش سہیل کو خوش رکھنے کی اور گھر کو جنت بنانے کی کرو گی۔"

نصرت اسی کے گلے سے لپٹی سسکتی رہی۔

(۷)

نصرت کو کشمیر آئے مہینے بھر سے زیادہ ہوگیا تھا۔ ایک دن شام

کو ریحانہ اصرار کر کے اسے شکارے کی سیر کے لئے لے گئی۔ ریحانہ کے شوہر
پیچھے کی طرف بیٹھے تھے نصرت ریحانہ اور ریحانہ کا بچہ تکیوں کے سہارے
لیٹے ہوئے تھے۔ شکارا ڈل پائنٹ سے آگے جا رہا تھا کہ مقابل سے ایک
اور شکارا آتا نظر آیا جس میں صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ نصرت نقاب
الٹے بے خیالی میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن ریحانہ کی نظر اس کے
پر جم گئی جب شکارا قریب آیا تو وہ آگے کو اور زیادہ جھک گئی......
اس نے دیکھا کہ شکارے کے تکیوں سے سہارا لگائے سہیل آنکھیں بند
کئے لیٹا ہے اس نے اپنے شوہر کو ٹھوکا دیا " دیکھتے ہو یہ کون ہے شکارے
میں ؟" جمال نے ادھر دیکھا اور ایک دم چیخ پڑا " ہلو سہیل ...... ہلو سہیل
نے ادھر دیکھا۔ سامنے ریحانہ اور نصرت بیٹھی نظر پڑیں۔ چند سیکنڈ کے لئے
وہ مبہوت سا ہو گیا دونوں شکارے بالکل برابر برابر چل رہے تھے ریحانہ
نے اصرار کیا " سہیل بھائی آجایئے اس میں آجایئے پھر باتیں ہوں گی "
سہیل نے چند لمحے تامل کیا اور آخر کود کر ان کے شکارے میں آ گیا۔ اب
ریحانہ کو نصرت کا خیال آیا اور وہ ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی " میری بہنا
مبارک ہو " مگر وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی نصرت بے ہوش پڑی تھی۔ اس نے
بدحواس ہو کر کہا " دیکھو تو سہیل بھائی اسے کیا ہوا " سہیل نے گھبرا کر نصرت
کو دیکھا۔ اگرچہ نصرت اب پہلے سے بہتر تھی پھر بھی سہیل کو اسے دیکھ کر سخت
افسوس ہوا اس کا بھرا بھرا ڈیل اور سرخ و سفید چہرہ بالکل بدل گیا تھا
اس نے اپنا ٹھنڈا برف سا ہاتھ نصرت کے ماتھے پر رکھا تو وہ پسینے سے

مرا پورتھی۔ ریحانہ نے پانی لے کر نصرت کے منہ پر چھینٹے دیئے اور آنچل سے ہوا دینے لگی۔ نصرت نے نقاہت سے آنکھیں کھول لیں، سہیل کا ہاتھ ماتھے پر رکھا اور اس کی آنسو بھری آنکھیں اپنے چہرے پر جمی ہوئی دیکھیں —— یہ مشکل اتنا کہا "ریحانہ ان سے میرا قصور معاف کرا دو۔" اور سہیل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ سہیل کے آنسو ٹپ ٹپ نصرت کے چہرے پر گر رہے تھے۔ ریحانہ نے منہ پھیر کر اپنے آنسو پونچھے مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ کہ دونوں کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ سہیل نے محبت سے نصرت کے ہاتھ کو دبایا اور کانپتی ہوئی آواز سے اس کے کان میں کہا "نصرت میری جان۔" نصرت نے سہیل کے اچکن کے دامن میں منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(۸)

سال بھر بعد سہیل اور نصرت نے سخت اصرار کر کے ریحانہ اور جمال کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ دسمبر کی چھٹیوں میں جمال ریحانہ کو لے کر کانپور سہیل کے ہاں پہنچا تو سہیل اور نصرت نے دونوں دوستوں کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ان کے رہنے کے لئے دو کمرے الگ سجا دئے گئے تھے اور ہر قسم کی ضرورت اور کام کی چیزیں وہاں رکھ دی گئی تھیں۔ جب وہ دونوں نہا دھو کر فارغ ہو گئے تو نصرت نے کھانے کے کمرے میں لے جا کر سب کو چائے پلائی۔ چائے کے بعد جمال تو سہیل کے ساتھ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور نصرت نے ریحانہ کا ہاتھ پکڑ

کہا "چلو تمھیں ایک نئی چیز دکھاؤں" ریحانہ نے نصرت کے خوشی سے چمکتے ہوئے بشاش چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا "ماشاء اللہ تم خوش تو بہت معلوم ہوتی ہو مگر اس قدر کمزوری کیوں ہو رہی ہو کیا بات ہے کیا صحت ٹھیک نہیں رہتی؟" نصرت ہنس پڑی "نہیں صحت تو اچھی ہے تمھیں تو یوں ہی وہم ہے چلو میرے کمرے میں تمھیں ایک عجیب سی چیز دکھاؤنگی" ریحانہ نصرت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر آئی۔ نصرت نے کمرے کی چک اٹھائی اور ریحانہ اندر داخل ہوئی۔ ایک طرف تخت پر سلمہ بیٹھی ایک چھوٹا سا کرتا سی رہی تھی اور نصرت کے چھپرکھٹ کے برابر ایک ننھا سا پالنا رکھا ہوا تھا جس پر جالی کی مسہری ڈھکی تھی اور اس کے پاس ایک سیاہ رنگ کی آیا بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ نصرت نے مسہری کی جالی اٹھائی۔ ریحانہ نے دیکھا ایک دو مہینے کی عمر کا بچہ، گورا رنگ، سیاہ ریشم سے بال، بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں کھولے، ننھے سے منہ میں انگوٹھا لیے چوس رہا ہے۔ بچہ اس قدر بھولا اور پیارا تھا کہ ریحانہ نے بے اختیار جھک کر پیار کیا اور پھر جلدی سے پلٹ کر نصرت سے بولی "یہ کس کا بچہ ہے کیا تمھارا؟" نصرت نے مسکرا کر ریحانہ کو دیکھا اور شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ ریحانہ خوشی کی چیخ مار کر نصرت سے لپٹ گئی۔

"یہ بات اور چھپکے چھپکے ہمیں خبر بھی نہیں"

سلمہ نے کہا "ہم سب نے کہا اپنی دوست کو خبر کردو مگر دلہن

کی ضد تھی کہ جب وہ آئیں گی تب بتاؤں گی۔" ریحانہ سلام کر کے سلمہ کے
پاس بیٹھ گئی۔ "لڑکا ہے یا لڑکی؟" سلمہ نے کہا "لڑکی اے بہن یہ لڑکی ہزار
لڑکوں کے برابر ہے اللہ نے یہ دن تو کیا کہ اس گھر میں بچے کی
صورت نظر آئی۔ خدا اسے اور ماں باوا کو جیتا رکھے۔ بچہ بھی ہو جائے
گا۔" ریحانہ نے بچی کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے بولی "لو
مجھے خبر ہی نہیں تھی کہ میرے جمیل کی دلہن بھی آگئی ہے۔" نصرت نے
ریحانہ کی کمر پر ہاتھ مارا "ہٹو یہ جاہلوں کی باتیں نہ کرو ہاں ریحانہ
پرسوں نسترن کا مونڈن ہے کل بھابی اور آپا وغیرہ بھی آجائیں گی۔"
تھوڑی دیر بیٹھ کر ریحانہ اور نصرت اٹھ کر باہر آئیں جمال اور سہیل
باتیں کر رہے تھے۔ ریحانہ نے چیخ کر کہا "سنتے ہو! سہیل بھائی کو
مبارک باد تو دو۔ ایک ننھی منی سی پیاری پیاری بچی کا اللہ نے باپ
بنا دیا اور میرے جمیل کی ایک ننھی سی دلہن آگئی۔" سہیل ہنس پڑے
نصرت نے شرما کر سر جھکا لیا اور جمال نے دونوں کو بہت بہت
مبارک باد دی۔ ریحانہ نے کہا "پرسوں بچی کا مونڈن ہے، ادھر آنا
جمال ایک کام ہے" جمال اور ریحانہ بچی کے لئے کچھ تحفہ خریدنے کی
بابت باتیں کرنے لگے۔ سہیل نے نصرت کی طرف دیکھا۔ نصرت ایک
صوفے پر بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ سہیل نے پاس آکر کہا "نصرت کسے
امید تھی کہ مجھے میری پیاری بیوی واپس مل جائے گی اور ایسی پیاری
بچی بھی؟" نصرت نے اشک آلودہ آنکھیں اٹھائیں "اور نہ مجھے یہ امید

تھی کہ میں اپنے سہیل کو پھر پا سکوں گی۔" سامنے سے ریحانہ اور جمال مسکراتے ہوئے آتے نظر آئے۔

آگاہ شو تپ دروں را

شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر جوٹی بی اسپتال تھا، ڈاکٹر کیلاش اس کے انچارج ہو کر کچھ مہینے ہوئے آئے تھے۔ ڈاکٹر کیلاش میری دوست ساوتری کے شوہر تھے۔ میں کئی مہینے سے ساوتری سے ملنے جانے کا ارادہ کر رہی تھی جو خدا خدا کر کے آج پورا ہوا۔ خوب کھلی ہوئی جگہ میں ایک طرف بڑا سا احاطہ تھا جس کے اندر اسپتال کی سرخ رنگ کی عمارت دور ہی سے دل میں وحشت پیدا کر رہی تھی۔ آس پاس کئی بنگلے تھے ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے جا کر میرا تانگہ رکا۔ اطلاع ملتے ہی ساوتری میری پیشوائی کو باہر نکل آئی اور دوڑ کر گلے سے لپٹ گئی۔ تین چار سال کی جدائی سے ہماری دلی محبت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔

میں اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ کمرے میں تین عورتیں اور بیٹھی ہیں۔ ایک سفید ملگجے کپڑوں میں ہے جس کی عمر ۳۵—۴۰ کے درمیان ہے یہ وضع سے بیوہ معلوم ہوتی ہے۔ دوسری رنگین کپڑے

اور چوڑیاں وغیرہ پہنے ہے کوئی ۲۵ برس کی عمر ہوگی۔ تیسری ایک نوجوان
لڑکی ہے مشکل سے سترہ اٹھارہ برس کا سن، سانولا رنگ جس میں ہلکی ہلکی
سرخی کی جھلک، بڑی بڑی خواب آلودہ آنکھیں اور لمبی لمبی سیاہ پلکیں، چھوٹا
سا دہن اور بھرا بھرا ڈیل۔ ہاتھوں میں لال سبز چوڑیاں اور مہندی، کانوں
میں بالیاں ناک میں کیل اور انگلیوں میں چاندی کی گھونگھرودار چھلے۔ بڑی
پیاری معلوم ہوتی تھی۔ گود میں ایک چھوٹا سا کمزور بچہ پڑا سو رہا تھا۔ تینوں
عورتیں سخت پریشان اور بدحواس تھیں۔ بیوہ عورت ہچکیاں لے لے کر رو
رہی تھی۔ دوسری بھی غمگین تھی اور نوجوان دلہن بت کی طرح ساکت اور
خاموش بیٹھی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے اس جنگلی ہرنی کی سی وحشت اور
بے قراری برس رہی تھی جو کہیں جائے پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔ میں کمرے
کا یہ سین دیکھ کر گھبرا گئی کہ یا اللہ یہ کون عورتیں ہیں اور ان پر کیا بپتا پڑی
ہے۔ خیر ہم بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ساوتری انھیں تسلی دینے کی کوشش کرنے
لگی "ایشور پر بھروسہ رکھیے وہ اچھا کرنے والا ہے اس نے کرپا کی تو محسن
صاحب اچھے ہو جائیں گے" بیوہ (جو بعد میں معلوم ہوا کہ محسن کی بہن تھی)
نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "بہن اب تو وہ بول بھی نہیں سکتا۔ زبان بند
ہو گئی اشارے سے بات کرتا ہے پر پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔
دلہن اور بچے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی"
یہ کہتے کہتے بدنصیب بہن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہم دونوں کی آنکھوں
میں بھی آنسو بھر آئے۔ پر دلہن اب تک حیرانی اور وحشت سے سب کا

منہ تک رہی تھی اور بار بار اس کی نظریں اپنے ننھے بچے پر جم جاتی تھیں۔
کچھ دیر بعد ان لوگوں کا تانگہ آ گیا۔ عورتوں کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ مگر اسپتال کے قانون سے مجبور تھیں کہ رات کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ساوتری نے کہا بھی کہ آپ یہاں رہ جائیے مگر ان کے ساتھ جو مرد تھے وہ اصرار کر کے انھیں سوار کرا لے گئے۔

میں نے ان کے جانے کے بعد ساوتری سے پوچھا "ساوتری ان کا کون عزیز بیمار ہے؟" ساوتری بولی "نسیم بہن ان کا حال بڑا پُر درد ہے۔ ایک شخص محسن تین مہینے سے یہاں اسپتال میں ہے۔ مرض آخری درجہ پر پہنچ کر لاعلاج ہو چکا ہے۔ یہ تینوں اس کی بہن بھاوج اور بیوی تھیں۔ بچارے کی حالت کئی روز سے زیادہ خراب ہے۔ یہ اکثر مریض کو دیکھنے آتی ہیں تانگہ وغیرہ ملنے میں دیر ہوتی ہے تو میں یہاں بلا لیتی ہوں۔" اتنے میں ساوتری کا تین سال کا بچہ کرشن آ گیا۔ میں نے گود میں لے کر اسے پیار کیا۔ اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ مینا کی طرح چہکتا تھا۔ میں اور ساوتری اس کی بھولی بھولی پیاری پیاری باتوں میں محسن کا قصہ بھول گئے۔ کھانا کھانے کے بعد پھر ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔

میں نے کہا "ساوتری تیرا ہی دل ہے کہ اس وحشت ناک اجاڑ جگہ میں اکیلی رہتی ہے۔ میں تو ہفتے بھر میں پاگل ہو جاؤں۔ ساوتری مسکرائی "تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ زندگی بس وہی ہے جو شہر کے شور و شغب، دلچسپیوں اور تفریحوں، سوسائٹی سے میل

جوں وغیرہ میں بسر ہو۔ پر میرا یہ خیال نہیں۔ انسان دل لگانا چاہے تو
جنگل بیابان میں بھی اکیلا خوشی و اطمینان سے رہ سکتا ہے۔ اور میں تو اکیلی
بھی نہیں — جب اپنا پتی اور بچہ ساتھ ہو تو جنگل میں بھی منگل ہو سکتا ہے
جب زندگی کے دو انمول موتی میرے پاس ہیں تو میں تنہا کب ہوں"۔ یہ
سن کر میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہی پرانی منطق"۔ چلو خیر تمھیں اپنی خواہش
کے مطابق رہنے کو جنگل مل گیا۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دن بھر کرتی
کیا ہو گی؟" ساوتری نے کہا "یہ بھی خوب رہی۔ ارے بھئی کرنے کو گھر
کا کام کاج بچے کی دیکھ بھال وغیرہ کیا کم ہے اور فرصت کے وقت
کا بھی ایک شغل میں نے نکال لیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے ہمیشہ سے
مریضوں سے دلچسپی ہے (مسکرا کر) تبھی تو میں نے ایک ڈاکٹر سے بیاہ کیا۔
میں اسپتالوں کی مریض عورتوں اور مریض مردوں کی رشتہ داروں
سے ملتی جلتی رہتی ہوں۔ ان کا حال احوال سنتی ہوں اور ان کی تسلی تشفی
کرنے کی کوشش کرتی ہوں"۔ "مجھے دق کے مریضوں کے خیال ہی سے
جھرجھری آ گئی" "اف ساوتری۔ ایسے سخت مریضوں سے ملنا اور ان کا
حال سننا تیرا ہی کام ہے۔ مجھے تو یہ سن کر ہی گھبراہٹ اور دہشت ہوتی
ہے۔ ان کے حالات تو بڑے دردناک ہوتے ہوں گے"۔ ساوتری کا
کھلا ہوا چہرہ اداس ہو گیا "ہاں بہت دردناک لیکن ساتھ ہی دلچسپ
اور سبق آموز بھی۔ جب میں ان کھانسی بخار کے مارے ہوئے سوکھے زرد
اور مدقوق لوگوں کو دیکھتی ہوں تو میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میرا دماغ

سینکڑوں قسم کے خیالات سے بھر جاتا ہے۔ مجھے ان مریضوں میں ہندوستان کی فلاکت، غربت اور جہالت مجسم ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے ان لوگوں کو دیکھ کر اور ان کا حال سن کر اندازہ ہوا کہ ہمارے ہاں کی خانگی زندگی کس قدر بے لطف اور بے مزہ ہے۔ بزرگوں کی بے جا سختیاں، میاں بیوی، ساس بہو، سوتیلی ماں بیٹی، نند، بھاوج وغیرہ کے خراب تعلقات کس قدر تکلیف دہ اور مہلک ہیں کہ اکثر اوقات جان لے کر چھوڑتے ہیں۔ آہ یہ دو جان لیوا آفتیں ــــ آپس کی نااتفاقی اور غربت۔ ٹی بی بن کر ہمارے نوجوانوں کی جانیں بہت بڑی تعداد میں لے لیتی ہیں۔ اس کا اندازہ بس وہی کر سکتا ہے جس کا ان مریضوں کے ساتھ اتنا رہنا ہو جتنا میرا۔"

ساوتری کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ میں اس کی درد آشنا اور حساس طبیعت کو خوب جانتی تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ اگر یہ یوں ہر مریض کا اثر لیتی رہی تو خود اس کی صحت خطرے میں پڑ جائے گی۔ "فلمی صاحب بس رہنے دو۔ تم آخر کیوں ہر وقت وہاں آتی جاتی رہتی ہو کچھ زیادہ اسپتال میں جانا ٹھیک نہیں۔ جانتی نہیں ہو کیسا خطرناک اور متعدی مرض ہے۔"

ساوتری کو غصہ آ گیا "کیوں نہ جاؤں؟ تم سمجھتی ہو کہ اگر وہاں نہ جاؤں گی تو وہ احساسات مٹ جائیں گے جو میرے دل میں پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر تمہارے جسم میں ایک زخم موجود ہے وہ رس رہا ہے۔ اس

میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں تو کیا اس کو چھپا دینے سے یہ احساس مٹ سکتا ہے کہ زخم ہے اور وہ...... " میں نے مسکرا کر بات کاٹی " ظالم میرے کیوں خواہ مخواہ زخم لگا دیا " ساوتری میری بات پر توجہ دیئے بغیر کہے گئی " بھارت ماتا کے جسم پر بہت سے پھوڑے ہیں جن کے درد سے وہ چیخ رہی ہے ۔ اس کے ایک پھوڑے کی جھلک میں نے بھی دیکھ لی ہے ۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اس مہلک اور موذی مرض کی ترقی اور بیش قیمت جانوں کی قربانی کا سبب کیا ہے....... ؟ میں بے بس ہوں اس کے اسباب دور نہیں کر سکتی لیکن اس درد سے تڑپتی ہوں اور اسپتال جا کر مریضوں کو دیکھ کر ان کے حالات سن کر اپنے اس درد کو اور بڑھاتی ہوں ــــ اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتی ہوں ؟"

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے گردوپیش کے تکلیف دہ واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور دل کو یہ جھوٹی تسلی دیتے رہتے ہیں کہ سب لوگ اپنے اپنے حال میں خوش اور مگن ہیں ۔ میں کبھی اس طرح کی باتیں سوچنے اور مصیبت زدہ لوگوں کی حالت پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتی ۔ مگر اس وقت ساوتری کی باتیں سن سن کر میرا دل اندیشے کانپ رہا تھا اور جیسے کوئی کہہ رہا تھا تو دنیا سے بے خبر، کچھ نہیں جانتی کہ کیا ہو رہا ہے........ چند منٹ میں سوچتی رہی آخر اپنی دماغی الجھن سے گھبرا کر میں نے ساوتری سے سوال کیا۔

"آخر دق کے خاص اسباب ہیں کیا؟" ساوتری کا لہجہ دل گداز تھا "ڈاکٹر تو
سب خود تمہارے بہنوئی بھی یہ کہتے ہیں کہ دق کے اسباب ہیں خراب
آب و ہوا اور ناکافی غذا، وغیرہ۔ دق شروع ہونے کے بعد اگر فوراً
انتہائی احتیاط سے علاج دوا کی جائے تو شفا ہو سکتی ہے۔ لیکن زیادہ تر
مریضوں کا علاج تب شروع ہوتا ہے جب مرض بہت بڑھ چکتا ہے۔
رائے ان کی بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ نتائج کو دیکھتے ہیں سبب کو نہیں۔ میرا
تو خیال یہ ہے کہ اس کے خاص اسباب ہیں غربت، بے روزگاری،
نااتفاقی اور سختی۔ اور ایک کمانے والے کے سر سارے خاندان کا بوجھ ہونا
یہ بھی اس مرض کا بڑا سبب ہے۔"

میں نے بات کاٹی "اس سے اور ٹی بی سے کیا تعلق"

ساوتری نے جواب دیا "تعلق کیوں نہیں؟ جب ایک شخص
کو اپنی طاقت سے زیادہ محنت کرنی پڑے اور اس کمی کو پورا کرنے کے
لئے کافی غذا نہ ملے تو دق ہونا کیا مشکل ہے؟ قوی جسم والے جھیل جاتے
ہیں، کمزور اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں اب اچھے
قوی والے رہ ہی کتنے گئے ہیں؟ مرد جو اس مرض کا شکار ہوتے ہیں
ان میں زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو یا تو بے روزگاری کی مصیبت میں گرفتار
ہوں یا حد سے زیادہ کام کرتے ہوں اور سارے کنبے کی ذمہ داری ان
پر ہو۔ اور عورتیں عموماً گھروں کے لڑائی جھگڑوں اور میاں بیوی کی آپس
کی نااتفاقی کے سبب بیمار پڑتی ہیں۔ جب انسان کا دل ہی چین سے نہ ہو اور

رہر وقت وہ جلتا رہے تو اس سے ٹھیک طرح کھایا پیا جاتا ہے اور نہ دماغی سکون میسر ہوتا ہے۔ اور پھر آب و ہوا تو جیسی کثیف اور گندی ہمارے ہاں کی عورتوں کے حصے میں آتی ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اگر عورتیں اپنے مردوں کا ہاتھ بٹانے لگیں تو نہ صرف یہ کہ ان کو لڑنے جھگڑنے اور جلنے کلنے کی فرصت نہیں ملے گی بلکہ وہ گھر کی مالی حالت کو بھی سدھار لیں گی اور مردوں پر سے خرچ کے بوجھ کو کچھ ہلکا کر سکیں گی۔" میں نے پھر دخل دیا "ساوتری تم عورتوں کے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ امرا کے طبقے کو تو چھوڑ دو۔ اس میں تو مرد عورت دونوں ہی کاہل اور عیش پرست ہیں۔ لیکن متوسط اور غریب طبقے کی عورتیں تو مردوں سے بھی زیادہ کام اور محنت کرتی ہیں۔ مردوں کو آخری عمر میں تو کام سے چھٹی مل جاتی ہوگی مگر ان بچاریوں کو تو مرتے مرتے بھی گھر کے دھندے چین نہیں لینے دیتے۔" ساوتری بولی "بے شک غریب طبقے کی عورتیں تو اپنے مردوں کے برابر بلکہ ان سے زیادہ کام کرتی ہیں لیکن سب سے خراب حالت تو ہمارے متوسط طبقے ہی کی ہے۔ گھر بھر میں ایک یا دو عورتیں تو ضرور کام کرتی اور مرتی کھپتی رہتی ہیں لیکن باقی سوا پان چبانے دوسروں کی بدگوئی اور برائی بھلائی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کے اور کیا کرتی ہیں؟ اگر وہ اپنا وقت کسی مفید کام میں صرف کریں تو خود ان کی صحت کے لئے بھی اچھا ہو اور آمدنی میں بھی اضافہ ہو۔" میں نے کہا "ساوتری یہ تو تم سچ کہتی ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تو گھر میں

بیٹھنے والی عورتوں کے لیے بہت کم کام ایسے ہیں جن سے کچھ آمدنی ہو سکے۔
شوقیہ دستکاری کرنا اور بات ہے اور ضرورتاً اور۔ جب آدمی ایک کام
محنت اور شوق سے کرے اور وہ فروخت نہ ہو، اس سے کچھ ملے نہیں
تو دل بجھ جاتا ہے پھر برابر والوں کے طعن اور اعتراض، بولیاں ٹھولیاں
دل میں زخم ڈال دیتی ہیں۔ دوسری طرف مردوں کی خود ساختہ غیرت
کو فوراً ٹھیس لگ جاتی ہے کہ عورت کی کمائی مرد کھائیں!! ناک نہ کٹ
جائے گی؟ ساوتری نے دانت پیس لیے "ناک نہ کٹنے چاہے جان جاتی
رہے یہی جھوٹی اور بناوٹی شرافت اور احمقانہ غیرت تو اور زیادہ
عورتوں کو پست ہمت کر دیتی ہے۔ کسی میں احساس اور شوق ہو بھی تو
اس کا شوق پنپنے نہیں دیا جاتا۔ آخر ان کو یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ
ہم نے اپنی قوم کے آدھے حصے کو عضو معطل بنا رکھا ہے۔ خود مصیبتیں
بھرتے ہیں، مرتے کھپتے ہیں۔ لیکن عورتوں کو قید سے نہیں نکالتے انہیں
صنعتی تعلیم نہیں دلواتے ——— اور یہ عورتیں اور مرد مختلف وجوہ سے
——— بیکاری اور بے روزگاری، لڑائی اور نا اتفاقی ——— حد سے
زیادہ محنت یا کاہلی ——— غرض اسی قسم کی باتوں کی وجہ سے مختلف
بیماریوں کی بھینٹ ہو جاتے ہیں جن میں سے اکثر دق کا نوالہ بنتے ہیں۔"
میں نے بات ٹالنے کو پوچھا "یہاں کتنے مریض تندرست ہو جاتے
ہوں گے؟" ساوتری نے غصے کے لہجے میں کہا "خاک بھی نہیں ہوتے
اول تو ایسے مریضوں کی جس دل سوزی اور لگن سے دیکھ بھال اور

تیمارداری ہونی چاہیئے وہ نہیں ہوتی۔ دوسرے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دق کے مریض کے لئے فکر اور پریشانی زہر سے زیادہ مہلک ہے۔ بھلا جسے یہ فکر ہو کہ میں یہاں اسپتال میں پڑا ہوں اور گھر والے فاقے کر رہے ہیں یا قرض کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں یا جس عورت کو میاں کی بیوفائی سے رنج ہو، یا آوارگی کا غم کھائے جا رہا ہو ــــ جسے ساس نند کے کچوکے اس حالت میں بھی چین نہ لینے دیتے ہوں بھلا وہ کیسے اچھی ہو۔"

کچھ دیر تک ہم دونوں گم سم اپنے اپنے خیالات میں غرق بیٹھے رہے یکایک ساوتری بولی " میں تمھیں مثال کے طور پر محسن صاحب کا قصہ سناتی ہوں ــــ وہ جن کی عزیز عورتیں شام میرے ہاں بیٹھی تھیں" میں نے اشتیاق سے کہا " ہاں ہاں ان کا قصہ ضرور سناؤ"۔ ساوتری افسوس سے بولی " قصہ کیا مصیبت بھری داستان ہے ایشور نہ کرے کہ کسی پر ایسی بپتا پڑے ــــ میرے اصرار پر محسن کی بہن نے سب حالات سب مجھے بتائے تھے بلکہ محسن کے دو تین خط بھی مجھے دئے تھے جن سے مجھے واقعات کا پورا پورا اندازہ ہوا ــــ محسن کی دو بہنیں تھیں اور ایک بڑا بھائی۔ ماں باپ بہت کم سنی میں چل بسے تھے۔ شاید ماں کو بھی یہی موذی مرض تھا۔ بڑی بہن نے اس چھوٹے بھائی کو بڑے پیار سے پالا پوسا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اس کے اپنے کوئی اولاد نہ تھی۔ مگر بدنصیب جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی۔ بڑا بھائی محسن سے کئی سال بڑا

ہے۔ اس کی شادی چھوٹی سی عمر میں ہو گئی تھی اور اب کئی بچوں کا باپ ہے۔ چھوٹی بہن کی شادی تین چار سال پہلے کی گئی مگر ساس نندوں کے طعنوں تشنوں اور میاں کی بے رخی نے سال بھر کے اندر ہی ختم کر دیا۔ بہانہ ہوا بچے کی پیدائش کا۔ ماں باپ کا اور خود اپنا جو کچھ اثاثہ تھا وہ سب بہن نے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی شادی اور محسن کی تعلیم پر صرف کر دیا۔ جب محسن نے دسویں پاس کی تو بہن بالکل خالی ہاتھ ہو چکی تھی اور یوں اعلیٰ تعلیم پانے کی حسرت محسن کے دل میں دفن ہو کر رہ گئی۔ بڑا بھائی بے فکرا اور لاابالی واقع ہوا ہے۔ اچھی نوکری ملتی نہیں پندرہ بیس کی کرنا اچھا نہیں لگتا۔ بس سارے دن بیوی سے گپیں ہانکنا اور بچوں سے کھیلنا اس کا شغل رہتا ہے۔ محسن کو میٹرک کے بعد نوکری کی تلاش ہوئی۔ بڑی مشکل اور کوشش سے ایک دکان پر پچیس روپے کی محرری ملی۔ دو ایک جگہ ٹیوشن کر لیا اور اس طرح چالیس روپے ماہوار کی آمدنی ہو گئی۔ لیکن بھائی بھاوج ان کے بچے۔ بہن اور خود سات آٹھ آدمیوں کا خرچ اور پھر کنبے رشتے میں بھرم قائم رکھنے کو لین دین کسی طرح پوری نہیں پڑتی تھی اور بدقسمتی سے وہ اپنے بھائی کے برعکس نہایت فرض شناس، ہمدرد اور حساس واقع ہوا تھا۔ وہ بچپن سے کمزور تھا اور کافی غذا نہ ملنے اور پے درپے صدموں کی وجہ سے کبھی بھی نوعمر لڑکوں کی سی چونچالی اور بشاشت تندرستی اور بے فکرا پن اس میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کو صرف ایک شوق تھا اور وہ تھا اعلیٰ تعلیم کا۔ مگر بچارے کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ نہ وہ کھیل کود میں

شریک ہوتا، نہ سیر تفریح کرتا نہ دوستوں میں گپ شپ۔ چپ چاپ اداس سا، سارے دن خاندان کے پالنے کے لئے محنت کرتا رہتا اسے اکثر نزلہ زکام ہو جایا کرتا۔ مگر علاج دوا کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا در اصل خرچ میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بہن اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھی آخر اس نے سوچا کہ اگر اس کی شادی کر دی جائے تو یہ افسردگی اور بے دلی دور ہو جائے گی۔ محسن نے انکار بھی کیا کہ اب خرچ میں پوری نہیں پڑتی پھر ایک آدمی کا اور خرچ بڑھ جائے گا۔ مگر سب کا اصرار تھا کہ نہیں شادی ضرور ہو۔ سب اپنا اپنا رزق ساتھ لاتے ہیں اور بیوی کی قسمت سے تو اللہ اور برکت دے گا ...... ہائے ہمارے ہاں کے لوگوں کی خوش اعتقادی۔ غرض پچھلے سال اٹھائیس انتیس کی عمر میں انھوں نے محسن کی شادی رچائی اور بھاوج بیاہ لائیں۔"

میں نے کہا" بڑی غلطی کی۔ اس بیچارے کی تو شادی ہونی ہی نہیں چاہیئے تھی جس میں اس مرض کا شائبہ بھی ہو اس کے لئے تو شادی سم قاتل ہے۔"

ساوتری بولی" مگر ہمارے ہاں تو ہر مرض کی دوا شادی ہے۔ بیمار ہے تو شادی کر دو، آوارہ ہے تو بیاہ رچا دو، بے روزگار ہے تو بیاہ کر دو۔ لڑکے والے کیا خیال کریں گے، خود لڑکی والے لڑکے کے چال چلن اور صحت کی طرف توجہ نہیں کرتے حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستانی عورت کی زندگی تمام تر شوہر سے وابستہ ہوتی ہے۔ جہالت

اور کیا - ہاں، تو اس زمانے میں محسن نے اپنے چچا زاد بھائی اور بچپن کے دوست ماجد کو ایک خط لکھا تھا دیکھو وہ میں تمھیں لا کر سناتی ہوں"۔ سادری اٹھی اور میز کی دراز سے ایک پرانا سا لفافہ نکال لائی جس میں معمولی کاپی کے کاغذ پر لکھے ہوئے کئی خط رکھے تھے ان میں سے ایک پرچہ نکال کر پڑھنے لگی۔

پیارے ماجد۔ سلام علیکم۔ آپا کے خط سے تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ اگلے ہفتے میری شادی ہونے والی ہے۔ خدا جانے تمھیں شرکت کے لئے چھٹی ملے گی یا نہیں؟ آجاؤ تو اچھا ہے ممکن ہے میرے دماغی انتشار میں کچھ کمی ہو جائے۔

شادی کے خیال سے آج کل گھر کا ہر فرد خوشی میں سرشار ہے، آپا کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ جو دو چار چھوٹے موٹے زیور باقی رہ گئے ہیں انھیں نئے سرے سے اجلوا اور بنوا رہی ہیں۔ حیثیت سے بڑھ کر دلہن کے لئے کپڑے بنائے جا رہے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان اکٹھا کیا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک نیا ولولہ اور نیا شوق پیدا ہو گیا ہے میں نے اپنی عمر میں آپا کو اس قدر خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور میں ہوں کہ اندیشوں سے لرزا جاتا ہوں کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔ سو روپے قرض لے چکا ہوں۔ شاید ابھی اور لینے

پڑیں۔ گھر کا خرچ ویسے ہی پورا نہیں پڑتا اب اور بڑھ جائے
گا تو کیا ہوگا۔ خود میری صحت اس قابل نہیں کہ اس سے
زیادہ محنت کروں۔ دن میں دس بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں
تب گھر والوں کو جتنی روٹی نصیب ہوتی ہے بہرحال آپا
کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے دنیا میں کون سی
خوشی دیکھی ہے کم از کم یہی سہی۔ مجھ پر جو گزرے گی سہ لوں
گا۔ لیکن مجھے اپنی مردہ دلی سے یہ فکر ضرور ہے کہ جو معصوم
لڑکی مجھ سے بیاہ کر آرہی ہے مجھے اس سے کوئی لگاؤ
اور انس ہوگا یا نہیں۔ یہ نہ ہو کہ میری حالت کا اثر اس
پر بھی پڑے۔ غرض سینکڑوں قسم کی الجھنیں گھیرے ہوئے
ہیں۔ تم ضرور آؤ۔ دنیا میں صرف ایک شخص ہے جو مجھے
سمجھ سکتا ہے اور جس سے میں بے تکلفی سے اپنے خیالات
اور تفکرات بیان کر سکتا ہوں۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت
ہے کہ وہ کون ہے؟

تمھارا محسن

ماجد کسی وجہ سے شادی میں نہ آسکا۔ محسن کو اپنی دلہن حد سے
زیادہ پسند آئی۔ شادی کے دو مہینے بعد جو خط اس نے ماجد کو لکھا وہ
بھی اس میں موجود ہے لو سنو۔

"میرے پیارے دوست! تمھاری شکایت سر آنکھوں پر

میں واقعی شرمندہ ہوں۔ مجھے یقین یہ ہے کہ تم خوشی سے معاف کر دوگے۔ تم اپنی بھابی کے متعلق پوچھتے ہو کہ کیسی ہیں پسند آئی یا نہیں؟ کوئی اور پوچھتا تو سوا خاموشی کے کوئی جواب نہ ملتا مگر تم میرے پیارے دوست اور رازدار ہو تم سے کیسی شرم۔

ناصرہ کو جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو چند لمحے کے لئے سکتہ میں آگیا۔ ماجد آج تک میں نے کسی عورت کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہ تھا۔ نہ اسے میری طبیعت پسند کرتی تھی اور نہ میرا دل ہی چاہتا تھا۔ لیکن ناصرہ میری اپنی تھی۔ خدا رسول اور پنچوں کی اجازت سے مجھے ملی تھی۔ شاید اس لئے کہ عمر میں وہ پہلی عورت ہے جس سے مجھے دلچسپی ہوئی وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوتی ہے اس کی بڑی بڑی خواب آلود آنکھیں، سرخی مائل گندمی رنگ چھوٹا سا خوبصورت دہن اور صراحی دار لمبی گردن لمبے لمبے سیاہ بال اور سیاہ گھنی پلکیں۔ یقین نہیں آتا کہ اس سے زیادہ حسین بیوی کسی کو ملی ہوگی۔ پھر ایسی سیدھی شریف اور نیک دل و بے زبان ہے کہ کیا بتاؤں۔ آپا کے ہر حکم پر سر جھکانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میں اس کی ناز برداری کرنا چاہتا ہوں مگر وہ میرے چشم و ابرو کے

اشارے پر چلنے کو تیار اور خدمت کو حاضر ہے۔ اب مجھے
اندازہ ہوتا ہے کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر بھی خون
اور حرارت ہے، میری دنیا بھی رنگین اور دلکش ہے۔ امجد
میں آج کل اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتا
ہوں جسے ایسی دولت بے بہا ملی ہو اس سے زیادہ خوش
نصیب کون ہوگا، میری بچاری کم نصیب دلہن!! اسے مجھ
سے بیاہ کرکے کیا ملا؟ وہ اس قابل تھی کہ بہترین سے بہترین
ملبوسات اور اعلےٰ سے اعلےٰ زیورات سے مزین ہوتی،
عمدہ سے عمدہ غذا ر کھانے کو اور نوکر خدمت کو حاضر رہتے
لیکن اس کی قسمت پھوٹی مجھ جیسے نادار چالیس روپے کی
آمدنی والے سے جس کے سر پورے خاندان کا بار بھی ہے
میں نے کئی جگہ اور چھوٹے موٹے کام تلاش کر لیتے ہیں اور
ہر طرح ناصرہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ خود
بہت قانع اور صابر لڑکی ہے۔ کبھی مجھ سے کوئی فرمائش
نہیں کرتی۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کروں تم میرا مذاق اڑاؤ
گے کہ اس نے بیوی کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے مگر
بھائی یہ جھوٹی تعریف نہیں اور پھر میرے نقطۂ نظر سے
دیکھو جسے عمر میں پہلی مرتبہ کسی سے دلچسپی اور محبت ہوئی ہے
پہلی مرتبہ!!

تمہارا محسن

محسن کی گرویدگی کو ہر ایک حیرت سے دیکھتا تھا۔ بہن خوش تھیں کہ ان کا انتخاب اس قدر کامیاب رہا۔ محسن کا مرجھایا ہوا چہرہ اور شگفتہ اور ہنستا رہتا تھا چار پانچ مہینے تک اسے معمولی زلہ تک نہیں ہوا لیکن ایک تازہ آفت نے محسن کو اس حسین خواب سے جگا دیا اور وہ تھا قرض کا تقاضا۔ محسن سخت پریشان ہو گیا۔ بہن نے سنا وہ بھی متفکر ہو گئیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مجبور ہو کر یہ صلاح دی کہ دلہن کا زیور بیچ کر قرض ادا کر دو۔ لیکن محسن۔ یہ کسی طرح گوارا نہ کیا۔ بہن نے اصرار کیا کہ اس وقت لے لو اللہ کرے گا ہاتھ فراغ ہوگا تو بنوا دینا۔ محسن نے رنجیدہ ہو کر کہا کہ مجھ سے ان کا رنجیدہ چہرہ نہیں دیکھا جائے گا۔ گئی ہوئی چیز غریبوں کو واپس نہیں ملا کرتی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے قرض خواہ کو قسط پر راضی کر لیا۔ دگنی محنت اور جوش سے کام شروع کیا۔ دکان پر کام کرتا۔ ٹیوشن کرتا، ادھر ادھر سے اور کام لے آتا اور قرض کی قسط ادا کر دیتا۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب بچہ کا باپ بننے والا ہے تو خوشی کے ساتھ اسے ایک نئی فکر بھی پیدا ہو گئی اور بچارے نے طاقت سے زیادہ محنت شروع کر دی۔ چوبیس گھنٹے کی فکر اور کام نے اس کی صحت پر اثر ڈالا۔ رنگ سیاہ پڑ گیا، چہرہ سُست گیا اور ہر وقت پریشان اور افسردہ سا رہنے لگا۔ سب سے پہلے بہن نے ٹوکا کہ اس قدر محنت نہ کرو صحت خراب ہو جائے گی۔ بھائی نے بھی کہا لیکن محض زبان سے یہ نہ ہو سکا کہ خود بھی ہاتھ پاؤں چلاتا اور اس کی فکروں کو کم کرتا۔

بیوی کم عمر اور ناتجربہ کار تھی لیکن آخر اس نے بھی میاں کی کمزوری اور اضمحلال کو محسوس کر ہی لیا اور اسے سمجھایا کہ اتنی محنت نہ کرو۔ تمہاری سلامتی میں مجھے چٹنی روٹی ہزار نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ پر محسن نے ہنس کر ٹال دیا چند مہینے اور یونہی گزر گئے اور محسن کی صحت زیادہ خراب ہونے لگی۔ اس زمانے کا محسن کا ایک خط ماجد کے نام سُنو۔

میرے پیارے ماجد۔ تم میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ بدنصیب کو کبھی خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ ناصرہ سی نعمت پا کر بھی میری قسمت میں سکھ نہ تھا اور ہوتا کیسے دن رات خرچ کی فکر، قرض ادا کرنے کا خیال اور ناصرہ کی تکلیف کا احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ دن رات کی محنت نے صحت بھی خراب کر دی۔ پہلے معمولی نزلہ کھانسی ہوا۔ جوشاندہ کا استعمال ہوتا رہا مگر بے فائدہ روز شام کو طبیعت بھاری ہو جاتی اور حرارت محسوس ہونے لگی۔ ایک دن زور کا بخار چڑھ آیا اور سخت انفلوانزا ہو گیا۔ حکیم نے دیکھا نسخہ لکھا اور پورے مہینے بھر تک علاج ہوا تب کہیں دکان پر جانے کے قابل ہوا اگرچہ حکیم کا اصرار تھا کہ پہلے بیس روز اور آرام کرنا چاہیئے مگر آرام کرتا تو کھاتا کیا؟ اب کام پر جاتا ہوں مگر طبیعت گری گری اور اداس رہتی ہے۔ ایک اور حکیم کو دکھایا وہ کہتا ہے کہ نزلہ بگڑ گیا ہے۔ اسی لئے کھانسی

اور حرارت ہے پر مجھے کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے میری زندگی تو ایسی خوشگوار نہیں کہ جینے کی ہوس ہو مگر جب آپا اور کم عمر ناصرہ کا خیال کرتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں نہ ہوا تو یہ دونوں کیا کریں گی ؟ ناصرہ بچے کی ماں بننے والی ہے بجائے اس کے کہ اس زمانے میں اسے خوشی اور اطمینان نصیب ہوتا اسے دن رات میری فکر رہتی ہے اپنے زیور بیچ بیچ کر میرا علاج دوا کرا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔۔ بد نصیب لڑکی

چار دن بعد۔ بھیا چار دن سے تیز بخار ہے۔۔۔۔ خدا جانے کیا ہوگا۔

تمہارا مریض محسن

ماجد کو محسن کا یہ خط ملا تو بدحواس دوڑا ہوا وطن گیا اور محسن کو دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ محسن اس کے ساتھ کا کھیلا ہوا دوست اور نہایت عزیز بھائی تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ ڈاکٹر نے کہا دق شروع ہو چکی ہے اور اگر نہایت احتیاط سے علاج کیا جائے تو اچھا ہونے کی پوری امید ہے دق کا نام سن کر دونوں بھائیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ محسن کو لمبی چھٹی دلائی اور باقاعدہ ڈاکٹری علاج کا انتظام کر کے ماجد واپس چلے گئے۔ محسن کے بڑے بھائی نے دوڑ دھوپ کر کے بیس بائیس کی نوکری کر لی۔ ناصرہ چپکے چپکے اپنے سب زیور بیچ بیچ کر محسن کی غذا اور دوا کا انتظام کراتی رہی۔ کچھ مدد

ماجد نے کی۔ چند دن طبیعت بحال رہی تھی کہ جاہل عورتوں نے کہنا شروع کیا" لو! لوج اللہ نہ کرے محسن کو دق ہو۔" "اسے کچھ نہیں نزلہ بگڑ گیا ہے فلاں حکیم کو دکھاؤ ان کا علاج ایک بر ایک ہے۔" "ان موئے ڈاکٹروں کی زبان کو دق ہوتی ہے۔" "دلہن تم میاں صاحب سے گنڈا منگوا کر گلے میں ڈال دو۔ اللہ نے چاہا تو اس کی برکت سے ایک پندھواڑے میں جی اچھا ہو جائے گا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹری علاج چھوڑ کر پھر حکیم کا علاج شروع ہوا اور تعویز گنڈے بھی ہونے لگے۔ مہینہ بھر کے اندر اندر محسن کی حالت اور بھی خراب ہو گئی ماجد کو خبر ہوئی تو وہ جا کر محسن کو مع بیوی اور بہن کے یہاں لے آیا اور باقاعدہ علاج شروع کرا دیا۔"

ساوتری نے یہاں تک سنا کر ٹھنڈی سانس بھری اور چپ ہو گئی میں جو کبھی حزنیہ افسانے بھی نہیں پڑھ سکتی اس قصے سے بے حد متاثر تھی اور بے اختیار میرا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ساوتری نے پھر کہنا شروع کیا۔

"محسن کی دلہن کی حالت عجیب تھی۔ بچاری میاں کی حالت دیکھ دیکھ کر گھلی جاتی تھی۔ کم گو اور شرمیلی ہونے کی وجہ سے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہتی بس چپ چاپ سب کا منہ تکا کرتی۔ بہن نے بھائی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا۔ نہ دن میں ایک منٹ کو چین لیتیں نہ رات کو آرام کرتیں تاکہ سوچنے اور فکر کرنے کا وقت بھی نہ ملے۔

محسن ہر وقت بیوی کے کمرے میں لیٹا۔ اس کی اداس صورت کو تکا

کرتا۔ اسے اپنی زندگی سے مایوسی ہو چکی تھی اور چاہتا تھا کہ زندگی کی جو چند گھڑیاں
باقی ہیں وہ اپنی پیاری بیوی کے پاس گزارے لیکن ناصرہ اتنی الھڑ تھی کہ اسے
آنے والی مصیبت کا پورا احساس ہی نہ تھا۔ ماجد کے ہاں آنے کے دو مہینے بعد
ناصرہ کے بچہ پیدا ہوا۔ بہت پیاری صورت مگر ماں کی پریشانی اور فکر کے اثر
سے بہت کمزور۔ محسن کی حالت بدستور خراب دیکھ کر ڈاکٹر نے رائے دی
کہ اسے ٹی بی اسپتال میں داخل کر دیا جائے۔ محسن اسپتال جانے پر کسی طرح
راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی کی آخری گھڑیاں اپنی بیوی
اور بچے بہن اور بھائی سے الگ بسر کرے۔ لیکن عزیزوں کو اتنی مایوسی نہیں
تھی۔ جب تک سانس ہے تب تک آس باقی رہتی ہے خصوصاً اس کی ناتجربہ
کار دلہن کو تو میاں کی صحت کا یقین تھا۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ اس کم عمری میں
جب کہ اس نے دنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا خدا اسے اتنا بڑا صدمہ نہیں
دے گا، بہشت کی محض یک جھلک دکھا کر اسے تپتے ہوئے صحرا میں نہیں
چھوڑا جائے گا اس کی زندگی اس قدر جلد برباد نہیں ہوگی،......اس کا
چہیتا دولہا زندہ رہے گا........ ضرور رہے گا.........اس کے اصرار
سے مجبور ہو کر محسن اسپتال جانے پر راضی ہو گیا تین مہینے سے محسن ہمارے
اسپتال میں ہے تیسرے چوتھے دن بہن بیوی اور کبھی کبھی بھاوجیں اسے
دیکھنے آتی رہتی ہیں۔ آج سنا ہے کہ حالت زیادہ خراب ہے...... ہائے
افسوس اس وقت انسان کیسا بے بس ہو جاتا ہے۔..............."

ساوتری کی آواز فرط گریہ سے رک گئی.......

صبح اٹھ کر پہلی خبر یہ سُنی کہ محسن کا رات انتقال ہو گیا اور اس کے عزیز صبح ہی لاش لے گئے۔.........

اگلے دن میں اور ساوتری دونوں محسن مرحوم کی بیوی اور بہن کے پاس پرسے کے لئے گئے۔ ایک معمولی سے مکان پر جا کر تانگہ رکا۔ پردیس کا واسطہ اور غربت کی حالت باہر مردوں کے پاس تو چند لوگ جمع تھے مگر اندر گھر کی صرف چار عورتیں اور دو ایک ہمسائیاں تھیں۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں میلی دری کے فرش پر محسن کی بیوی بہن اور بھاوجیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں بھاوجیں زار و قطار رو رہی تھیں۔ بہن کی تو ایسی بری حالت تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا تھا۔ انتہائی ضبط کے سبب اگرچہ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا مگر پھر بھی چیخیں نکل جاتی تھیں اور.........آہ.........

محسن کی ڈیڑھ سال کی بیاہی نئی دلہن لٹھے کی سفید چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ نہ ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں تھیں نہ کانوں میں بالیاں نہ ناک میں کیل۔ ہاں اجڑے سہاگ کی نشانی ہاتھوں میں مہندی اب بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ کھلی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے گول گول قطرے لڑھک لڑھک کر اس کے سینے پر گر رہے تھے جیسے کسی صناع کامل کی بنائی ہوئی پتھر کی مورتی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو گرنے لگے ہوں ــــ اور ــــ اور اس کی گود میں ایک چھوٹا سا پیارا پیارا بچہ اپنی یتیمی کی ہولناک مصیبت سے بے خبر لیٹا اپنا ننھا سا انگوٹھا چوس رہا تھا اور اپنی گول گول معصوم

آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر گویا اسے ڈھارس بندھا رہا تھا کہ "ماں نہ رو تیری بیوگی کا سہارا۔ تیری پہاڑ سی ناشاد زندگی کا کٹوانے والا..... تیری امید کا آخری تار..... میں موجود ہوں "

اس بچے کو دیکھ کر میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اور ہوک سی اٹھی کیا دیر سویر یہ کمزور بچہ بھی اسی موذی مرض کا شکار نہ ہو جائے گا جس کی بھینٹ اس کا نوجوان ناشاد باپ ہوا ؟؟

نمونۂ سفر

بمبئی اکسپریس ۔ ۱۲ سیٹ کا زنانہ انٹر کلاس ۔ ۳۰ ۔ ۳۲ عورتیں، متعدد بچے، پھلوں کے چھلکے، کھانے کے تیل ۔ بچوں کا پیشاب اور پاخانہ ۔ لوٹے گلاس صراحیاں بنٹے ۔ سوٹ کیس، بستر بند ۔ ٹرنک، صندوق، ٹوکرے ۔ کنستر ۔ گٹھریاں ۔ پاندان تھرماس ۔ پنکھے ۔ نہلیچے پوتڑے ۔ زیورات ۔ ریشم ۔ کھدر ۔ شور و غل ۔ رونا دھونا ۔ گالی گلوچ ۔ دھکم دھکا ۔

جلی حرفوں میں ہندی اردو اور انگریزی میں ۱۲ آدمیوں کے لئے لکھا ہوا ہے تین بینچ نیچے ہیں جن پر پھٹے گدے پڑے ہیں اور تین ہی اوپر لیکن وہ گدوں کے احسان سے سبکدوش ہیں ۔ ایک طرف کی بینچ پر چار عورتیں اور تین بچے ہیں اور پاندان واٹیچی کیس رکھ کر باقی جگہ روک لی گئی ہے ۔ بیچ کی بینچ کے سرے پر ایک بڑھیا دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہی ہے اور بار بار پاؤں پسارنے کی کوشش کرتی ہے جس پر ہر مرتبہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی جوان لڑکی منہ بنا کر جھٹکے سے اس کے پاؤں ہٹا دیتی ہے اور بڑھیا منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتی ہے ۔ بقیہ آدھی سیٹ پر چھ سات عورتیں

عورتیں بیٹھی باری باری ایک دوسری کو دھکے دے رہی ہیں تیسری سیٹ پر نو دس عورتیں جن میں اکثر کی گود میں ہر عمر و ہر سائز کے بچے ہیں، اٹ دھنس کر بیٹھی ہوئی ہیں جن کے لئے سرکنا تو بڑی بات ہے ہلنا بھی محال ہے۔ سیٹوں کی بیچ کی جگہ میں چھ چھ سات سات عورتیں اور بچے کھڑے یا کسی کے اسباب پر ٹکے ہوتے ہیں اور جھٹکوں اور دھکوں سے بار بار ادھر اُدھر لڑھک جاتے ہیں اوپر کی سیٹوں پر بے تحاشا سامان حد درجہ بدترتیبی اور پھوہڑ پن سے لدا ہوا ہے اور نیچے کے سیٹوں کے نیچے بھی یہی حال ہے۔ بعض عورتوں نے تھک کر اپنے بچوں کو اوپر کی بنچوں پر اسباب کے اوپر بٹھا دیا ہے ان کے سر چھت کو چھو رہے ہیں اور وہ ان کے گرنے کے خوف سے بھی کھڑی ہیں۔ دونوں دروازوں کے درمیان اور غسل خانے کے سامنے ٹرنک بستر اور ہر قسم کے اور سامان کا بے ڈھنگا ڈھیر ہے اور اس پر بھی عورتیں اور بچے بیٹھے یا ٹیک لگا کے کھڑے جھٹکے کھا رہے ہیں۔ پاخانے آنے جانے اور سوار ہونے کا راستہ بالکل مسدود ہے بائیں طرف کی کھڑکیوں سے دھوپ آکر سارے درجے میں پھیل گئی ہے جس کی گرمی بہت ہی خوشگوار ہے۔ کیونکہ مئی کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔

ایک بچے والی: "توبہ عورت تو نے تو مجھے پیس ڈالا۔ ذرا تو اُدھر سرک جا"

دوسری: "کہاں سرک جاؤں۔ دیکھ رے نا ہلنے کی بھی جگہ نہیں۔ یہ موٹی عورت مجھ پر لدی پڑی ہے"

تیسری: "واہ بہن جی میرے سر نہ ہو۔ تم خود ہی تو مجھے دھکے دے رہی ہو۔"

ایک لڑکی جو زنجیر پکڑے کھڑی ہے: "بہن ذرا اپنا پاؤں اُدھر کو ہٹا لو کہ میں پاؤں تو نکالوں۔ خود مزے سے بیٹھی ہو تو کھڑی ہونے والیوں کو بیٹھنے کی نہ سہی پاؤں رکھنے کی تو جگہ دو۔"

ایک چشمے والی خاتون ہنس کر: "جیسے مزے میں ہم لوگ بیٹھے ہیں بس ہمارا ہی دل جانتا ہے۔ تم کھڑی ہو اس لئے کم از کم ہل جل تو سکتی ہو یہاں تو سارا جسم سن ہو کر رہ گیا ہے۔"

لڑکی: "تو بسم اللہ آئیے آپ میری جگہ کھڑی ہو کر خوب ہل جل لیجئے۔ میں آپ کے بدلے بیٹھ کر سن ہو جاتی ہوں۔"

چشمے والی: "ہو بڑی ہوشیار مجھے تو دہلی تک جانا ہے۔ ایک دفعہ کھڑی ہو جاؤں تو پھر راستے بھر بیٹھنے کی جگہ مل چکی۔"

زیوروں سے لدی ہوئی ایک عورت دوسری سے: "بہن جی یہ چندن ہار تم نے کہاں بنوایا بڑا خوبصورت ہے۔"

"یہ میں نے بمبئی سے خریدا تھا۔ میں اپنے تمام زیور وہیں سے لیتی ہوں۔"

"میرا یہ نکلس اور بندے بھی بمبئی کے ہیں ہاں یہ چوڑیاں اور لاکٹ دلّی کے بنے ہیں۔ پورے بارہ تولے کا نکلس ہے اور دس کی چوڑیاں دونوں میں سچا جڑاؤ ہے سچا۔"

چشمے والی (مسکرا کر آہستہ سے) "جیسی تم خود سچی ہو۔ جھوٹا سونا دو روپے تولہ کا۔"

"کیا کہا جھوٹا سونا؟ تو خود کنگلی ہے کیا جانے زیور کسے کہتے ہیں، پیتل کی کمانی کا چشمہ لگا پتھر کے بندے کانوں میں لٹکا کر آئی ہے اصلی سونے کو جھوٹا بتانے۔"

"بکو مت۔ میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی۔"

"واہ رے۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی ہے۔"

دو چار عورتوں نے ہاں ہاں کر کے دونوں کو خاموش کر دیا۔ ایک نوجوان لڑکی سے جو خوبصورت لباس اور جگمگاتے زیوروں سے آراستہ اور بڑی سی سرخ بندی ماتھے پر لگائے تھی۔ ایک کھدر کی ساڑی والی نے پوچھا "معلوم ہوتا ہے آپ کی ابھی شادی ہوئی ہے۔" دلھن نے ایک ادا سے مسکرا کر سر جھکا لیا "جی اسی مہینے کی چار تاریخ کو۔" ایک اور عورت نے اپنے موٹے سے بچے کو بمشکل ایک طرف سے دوسری طرف لیتے ہوئے اشتیاق سے ہاتھ بڑھایا "اپنی انگوٹھیاں دکھانا بڑی پیاری بنی ہیں۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"ذرا اُتار کر دکھاؤ۔ کوئی کھا تھوڑا ہی جائے گا۔" دلھن نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا "تنگ ہیں۔ یونہی دیکھ لیجئے۔"

"توبہ کیا زمانہ ہے کسی کا اعتبار ہی نہیں کیا جاتا۔ مت دکھاؤ ہم نے کیا کبھی انگوٹھی نہیں دیکھی۔"

"لے بوا میرا بچہ پیاس سے تڑپا جاتا ہے ذرا اپنی ٹانگیں ہٹا دو تو میں نیچے سے صراحی نکال لوں۔"

"ہلنے کی تو جگہ نہیں پاؤں ہٹا کر رکھوں کہاں؟ اپنے سر پر کہ بٹھا یئے؟"

"میرے کیوں اپنے سر پر رکھو۔ یہ اچھی مصیبت ہے کہ بچہ پیاس سے اللہ نہ کرے مرجائے پر پانی نہ نکل سکے۔"

دوسری سیٹ سے ایک عورت اٹھی "الیشور کے لئے ذرا سی جگہ دو۔ کاکا کو ٹٹی جانا ہے۔"

"ٹٹی کے سامنے اتنا سارا سامان لدا ہے اور کتنی زنانیاں کھڑی ہیں جائے کی کہاں۔"

"کیسے بھی جاؤں پر کاکا کو ٹٹی تو کرنا ہے ذرا تو سرکو بہن جی۔"

"نہیں سرکتے ہٹو پرے۔"

"واہ واہ یہ اچھے نخرے ہیں۔ ایک تو لے کے ٹٹی بند کر دی اوپر سے غراتی ہو۔"

اندھی دیکھتی نہیں میرا پاؤں کچل دیا" یہ کہہ کر اس نے دھکیلا تو وہ ایک توندل عورت پر جا پڑی جس نے بھیانک آوازیں چنخنا شروع کر دیا۔ پاس بیٹھی ہوئی بڑھیا نے کہا "جب خیر سے میری بہو یہاں سے اتر جائے تب جانوں، کتنی منتوں اور مرادوں کے بعد تو بچہ ہونے کی آس ہوئی ہے اس دھکا پیل میں کچھ ہو ہوا گیا تو میں کیا کروں گی؟"

ہاں بوا بڑا مصیبت کا سامنا ہے پھر یہ کمبخت عورتیں ذرا کسی کا خیال

نہیں کرتیں "۔

تو کون ہیں کمبخت کہنے والی ہم کیا جان کر گر پڑے۔ رستہ نہ ملے کوئی دھکا دے دے تو ہم کیا کریں "۔

"ملے بہن بچے والیوں کی سفر میں بڑی آفت میں جان آجاتی ہے "۔

"مجھے دیکھئے۔ پشاور سے آ رہی ہوں۔ ایک رات ایک دن یونہی گود میں بچے کو لئے گزر گیا۔ نہ کھانا نہ پینا نہ ہلنا نہ سرکنا۔ اس نے رو رو کے اور زندگی حرام کر دی ہے "۔

کہاں جاؤ گی ؟" دلی اور تم کہاں جاؤ گی ؟" "بمبئی"

تو یہ ہے ایک سے زیادہ ایک دور کی ہے کوئی پاس اترنے والی بھی ہو یا نہیں ؟"

دو عورتیں پچھلی طرف کی سیٹ پر کونے میں دبی ہوئی بیٹھی آہستہ آہستہ باتیں کرتی جاتی تھیں اور دوسری عورتوں کی باتوں پر مسکراتی جاتی تھیں ایک نے دوسری سے کہا خدا دشمن کو بھی آجکل سفر نہ کرائے۔ سب سے بڑی سزا کسی کے لئے یہی ہے کہ اُسے سفر پر بھیج دو۔

" ہمارا خیال ہے کہ اس زمانے کے ملزموں کو یہی سزا دینی چاہیئے جس کا جرم معمولی ہو اسے پاس کے سفر پر جس کا جرم سنگین ہو اسے دور کے سفر پر بھیج دیا جائے " دوسری نے ہنس کر جواب دیا۔ ایک تھل تھل پنجابن بولی " ڈیڈھ ڈیڈھ ٹکٹ لیں کہ بیٹھنے کو جگہ ملے گی پر کھڑا ہونا بھی مشکل ہے۔ پیسے بھی کھرچو اور تکلیف بھی سہو "۔

"انٹر کیا، فسٹ سیکنڈ سب کا ایک حال ہے سیٹ رزرو نہ کراؤ تو جگہ نہیں ملتی۔ میرا سیکنڈ کا ٹکٹ ہے مگر ہر درجہ میں فوجیوں کی فوج موجود ہے۔ آخر میرے "ہسبینڈ" نے مجھے یہاں لاکر بٹھایا۔ پر یہاں اس سے بدتر حال ہے"، ایک فیشن ایبل خاتون نے پنکھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اور بھی مصیبت ہے۔ تھرڈ والیاں انٹر میں آئیں۔ سیکنڈ کے ٹکٹ جن کے ہوں انھیں بھی انٹر ہی پسند آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر انٹر والیاں کیا کریں۔ تم جاؤ نا سیکنڈ میں۔"

"تمھیں کیا ہم جہاں چاہیں گے بیٹھیں گے۔ تم منع کرنے والی کون۔"

"اوہو تم امیرزادی ہوگی تو اپنے گھر کی۔ ریل میں سب برابر ہیں۔"

"بکو مت۔"

"اے بہن جی یہ بچہ کیوں روئے جاتا ہے اسے دودھ دیدو نا۔"

"دودھ کہاں سے دوں صبح سے پانی تک تو پینے کو ملا نہیں دودھ کہاں سے اترے خود میرا کلیجہ بھوک سے کھِچا جا رہا ہے۔"

"بہت چھوٹا سا بچہ ہے کتنے دن کا ہے؟"

"دو مہینے کا۔ پندرہ برس کی آس کے بعد یہ بچہ نصیب ہوا ہے جب جی بچ جائے تب بات ہے۔"

ادھیڑ ماں نے اپنے کمزور بچے کو چومتے ہوئے جواب دیا۔

"ایشور جیتا رکھے۔"

"اے ہے ذرا بچا کر۔ توبہ سارا پیشاب میرے اوپر آگیا۔ کیسی گندی عورتیں ہیں"

"جو خود بانجھ ہو وہ کیا جانے بچے کی قدر۔ بچے ہگا موتا کرتے ہی ہیں ذرا سا پڑگیا تو گیا ہوا"

ایک تو بدتمیزی کی اوپر سے زبان درازی کرتی ہے" "بہن تم ہی چپ رہو۔ ان کے منہ کیوں لگتی ہو"

اسٹیشن کے آثار دیکھ کر سب نے ایک دوسرے سے بتیا بانہ پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم یہاں اتروگی مگر دو کے سوا کسی نے حامی نہ بھری۔ ایک بیٹھی ہوئی عورت اترنے والی تھی جس کی جگہ پر آٹھ سات پاس کھڑی ہوئی عورتیں دانت لگائے تھیں اور پاس بیٹھنے والی کھسک کر آرام سے بیٹھنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

"بہن جی تم میرا اسباب کھڑکی سے پکڑا دینا میں بھی کھڑکی سے کود پڑوں گی اور تم میری جگہ بیٹھ جانا"

اترنے والی نے رشوت پیش کی بیٹھنے والی نے خوشی سے قبول کرلی۔

کونے میں بیٹھی ہوئی دونوں ہنسوڑ عورتیں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی تھیں۔ کیوں بھابھی اب بھی اس درجہ میں اور عورتوں کی گنجائش؟ میں تو سمجھتی ہوں اب ایک بھی نہیں سما سکتی"

تم عورتوں کی خاصیت اور کمال سے بالکل سے ناواقف معلوم ہوتی ہو وہ تو ربڑ کی بنی ہوئی ہیں ربڑ کی۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ ان سے

زیادہ سخت جان مخلوق اللہ نے شاید ہی پیدا کی ہو۔ ابھی تو اس درجہ میں آٹھ دس عورتیں اور بچے "با فراغت" آ سکتے ہیں۔"

"توبہ توبہ خدا کی پناہ۔ بھابی میرا تو ابھی سے دم گھٹا جا رہا ہے۔"

"ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔"

"جی اور کیا۔ تقدیر جو دکھائے سو لاچار دیکھنا۔ یا اللہ اس اسٹیشن پر تو کوئی اور عورت نہ بیٹھے۔"

ضرور بیٹھیں گی۔ آخر نہ جائیں تو کیا کریں۔ ہر گاڑی میں رش کا یہی حال ہے۔"

"یہ امید کبھی تو نہیں ہوتی کہ اس میں نہ سہی دوسری میں جگہ مل جائے گی۔ دیکھتی ہو باہر کس قدر لوگ ڈنڈے پکڑے لٹکے کھڑے ہیں۔"

"لے ہے یہ گر پڑیں تو کیا ہو؟"

"ہو کیا؟ غلام اور بے بس ہندوستان کی آبادی میں نامعلوم سی کمی ہو جائے اور بس، اب تک سینکڑوں کیس ہو چکے ہیں۔"

"ریلوے اس کا تدارک کیوں نہیں کرتی۔"

کیوں کرے تدارک۔ فوجیوں کے لئے گاڑیوں کی ضرورت ہے فوجی سامان کے لانے لے جانے کے لئے ضرورت ہے آخر وہ ضرورتیں کہاں سے پوری ہوں، یہ چند گاڑیاں رہ گئی ہیں ان میں بھی آدھے سے زیادہ درجے فوجیوں کے لئے رزرو ہوتے ہیں اور باقی درجوں میں بھی وہ گھس کر قبضہ کر لیتے ہیں۔ آخر فوجی جو ٹھہرے، سرکار کے جانثار

سرکار کی حکومت کے قیام کے لئے خون بہانے والے۔ سرکار اور اس کے خوشامدی ان کے آرام کا بھی خیال نہ کریں؟ یہ کمبخت کالے لوگ بے مصرف، بے وقوف مرا کریں، مصیبت اٹھایا کریں۔ بلا سے ہرج ہی کیا ہے۔ یہ پیدا ہی سختیاں اٹھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ سرکار نے یا ریلوے نے ان کے آرام کا ٹھیکہ نہیں اٹھایا۔ اور پھر انھیں تو شکر کرنا چاہیئے کہ انھیں ایسی ترقی یافتہ، تیز رفتار اور مہذب سواری پر بیٹھنا، خیر وہ لٹکنا ہی سہی نصیب ہوتا ہے۔ مگر ناشکرے ہندوستانی اس پر بھی ہمیشہ شکوہ شکایت کرتے رہتے ہیں۔"

ایک عورت بچاری نہ جانے کیسے اڑدھام کر ضرورت پوری کرنے غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ وہاں سے جلتی بھنتی باہر نکلی "یہ غضب تو دیکھو غسل خانے میں پانی کا نام نہیں۔ پانی بھی کیا جنگ پر چلا گیا؟"

"بہن اب پانی پینا اور استعمال کرنا بھی بند کردو۔ یہ بھی سرکار کی مہربانی تھی کہ اتنے دن پانی استعمال کرنے کی اجازت تھی۔"

"سرکار سرکار کیا کرتی ہو۔ یہ سب قصور ریلوے والوں کا ہے۔"

"کسی کا بھی ہو۔ ہم کیا جانیں۔"

"ہاں جی فسٹ سیکنڈ والوں کو پانی کی ضرورت ہے۔ غریبوں کو یہ بھی نہیں ملنا چاہیئے۔"

"اسٹیشنوں پر بھی تو پانی نہیں ملتا۔ بچہ کب سے پیاسا بلک رہا ہے پچھلے اسٹیشن پر نل تھا مگر اترنے اور پانی پینے کی کہاں جگہ۔"

"میری صراحی سے پانی لے کر بچہ کو پلا دو۔"

"تم ہندو ہو بہن جی؟"

"نہیں میں تو مسلمان ہوں۔"

"رام رام پھر پانی کیسے پلا دوں۔"

"ہاں چاہے بچہ پیاس سے بے حال ہو جائے، پر چھوت چھات نہیں چھوڑی جا سکتی۔ واہ رے ہمارے ہندوستان۔"

"بھلا ملیچھ لوگوں کا پانی کیسے بچہ کو پلا دوں۔"

"ہم مسلمانوں جیسے گندے نہیں۔" "تم کافروں کو دیتا ہی کون ہے ہم نے تو بچہ پر رحم کھا کر کہا تھا۔ نہ لو جاؤ بھاڑ میں۔"

اسٹیشن نے عورتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ سب عورتیں ایک دوسرے کو ٹکٹکی لگا ہوں سے دیکھ رہی تھیں کہ یہاں اتر جاؤ۔ صرف دو عورتیں ہزار مصیبت کے بعد اترنے میں کامیاب ہوئیں ہر درجے سے پانی پانی کی صدائیں بلند تھیں مگر پانی والے کا پتہ نہ تھا۔ شاید فسٹ یا سکنڈ کی طرف ہو تو ہو۔ زنانہ انٹر میں دو قلی، دو تین عورتیں اور دو تین مرد گھسنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اندر سے عورتیں کہہ رہی تھیں "انٹر ہے انٹر" "ڈیوڑھا ہے ڈیوڑھا" جواب ملتا "ہاں ہاں اسی میں جانا ہے۔" دروازے کے پاس کی عورتیں لاکھ سمجھا رہی تھیں کہ "بھئی دھکے نہ دو پیچھے سرکنے کی بالکل جگہ نہیں آخر ہم کہاں ہٹیں،" مگر بدتمیز قلی، جاہل گنوار اور تعلیم یافتہ صاحبان سب کے سب عورتوں کو دھکیل اور ڈانٹ رہے تھے ہم اندر آ کر اسباب رکھیں اور

اپنی عورتوں کو چڑھائیں۔ کسی نہ کسی طرح دو تین عورتیں چڑھ گئیں اور ایک آدھ قلی بھی گھس آیا۔ مگر ایک نوجوان اور اس کی بیوی کو پھر بھی رستہ نہ ملا اس نے ادھر ادھر دیکھا تو کھڑکی کے پاس کی دونوں پردے دار عورتوں کو دھکیلا اور ٹانگ ڈال دھم سے کھڑکی کے اندر گھس آیا۔ نہ عورتوں کی چیخ پکار کی پروا کی نہ بچوں کے رونے کی، کسی کا پاؤں کچلتا کسی کے سر سے سر ٹکراتا اندر جا کر کھڑا ہو ہی گیا اور کھڑکی ہی کی راہ قلی سے اسباب لے کر اندھا دھند ادھر ادھر رکھنا شروع کر دیا۔ لاکھ عورتیں کہہ رہی ہیں بھیا ذرا دیکھ کر۔ ارے ٹھیک طرح رکھ ورنہ یہ صندوق کسی پر گر جائے گا، مر موئے مجھ پر یہ صندوقچہ کیوں پھینک دیا پر اس کی سنتے بلا۔ اور سُن کر کرے بھی کیا جب سامان رکھنے کی کہیں جگہ ہی نہ ہو۔ اسباب چڑھانے کے بعد اس نے اپنی نوجوان بیوی اور سال بھر کے خوبصورت اور تندرست بچے کو درجہ کے اندر گھسیٹا اور بغیر اس کی پروا کے کہ بیوی کو کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ ہے یا نہیں، چلتی گاڑی سے کود کسی دوسرے درجہ کا ڈنڈا پکڑ کر لٹک گیا۔

درجہ کی عورتیں جو یونہی جان سے بیزار ہو رہی تھیں اور بھی جل گئیں۔ کئی نئی آنے والیوں سے الجھنے لگیں۔ خوبصورت بچے کی ماں آس پاس کی عورتوں کا نشانۂ ملامت بنی ہوئی تھی اور بے بسی سے بار بار کہتی تھی "وہ کیا کرتے، جب دروازے سے گھسنے کا رستہ نہ ملا تو مجبوراً کھڑکی سے اندر آئے کسی اور درجہ میں بھی جگہ نہ تھی۔ جانا تو لازمی تھا بہت ضروری کام ہے۔" دو مہینے کے کمزور بچے کی ادھیڑ ماں نے اوپر کی سیٹ پر فولادی ٹرنک کو بُری طرح

جھوُلتے ہوئے دیکھا تو بچے کو گود میں چھپا کر بولی " ذرا اپنے اس ٹرنک کو تو ٹھیک سے رکھ دو۔ کیسی بُری طرح ہل رہا ہے کہیں گر گرا نہ پڑے "، دو ایک اور آوازیں آئیں "ہاں ہاں ٹرنک ٹھیک طرح رکھو گر گرا پڑا تو دو ایک کی جان لے گا "

" بھلا آپ ہی کہئے میں اکیلی اتنے بڑے ٹرنک کو کس طرح اٹھاؤں اور کہاں رکھوں؟ بہت بھاری ہے "

" تو کیوں اتنا بھاری ٹرنک لے کر چلی تھیں "

" یہ بھی کوئی زبردستی ہے کہ بھاری ٹرنک ساتھ نہ لیا جائے "

" آخر تم لوگ سامان بریک میں کیوں نہیں دیتے "

" کرایہ جو دینا پڑتا ہے۔ اور پھر ساتھ والوں کو ستانا جرم ہوا "

" بچے کو تو نہ سنبھلتے۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں "

" یہ ٹرنک ضرور گرے گا۔ ٹھیک طرح رکھو نا اسے "

" آپ لوگوں میں سے کوئی میرے بچے کو تھام لیں اور دو بہنیں میری مدد کریں تو میں نیچے سے بستر نکال کر اسے اچھی طرح رکھ دوں گی "

" نہ بوا میرے بستر کو ہاتھ نہ لگانا۔ واہ ایک تو اس پر جن کا جن ٹرنک رکھ دیا اب اسے اٹھانے لگیں "

میں بستر کو ٹرنک کے اوپر رکھ دوں گی " مگر آس پاس کی کوئی عورت مدد کے لئے نہ اٹھی۔ کونے میں بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا " بھابی میں جاتی ہوں ٹرنک اٹھوانے "، مگر عورتوں نے رستہ نہ دیا اور لڑنے لگیں۔ بیچاری لڑکی گھبرا کر

بیٹھ گئی۔ بچے والی گود میں بچے کو لئے لئے بڑبڑائی "تو میں اکیلی کیا کروں
چھوٹے دو ٹرنک کو۔ مجھے خود ذرا سا پاؤں ٹکانے کو بھی جگہ نہیں"۔

درجہ دھوپ کی حدت سے آگ کی طرح تپ رہا تھا اور لُو کے تھپیڑے
سونے پر سہاگا تھے۔ دو چار عورتوں میں اس بات پر جھڑپ ہو رہی تھی کہ کھڑکیاں
بند کی جائیں یا نہیں۔ ایک کہتی گرمی ہو جائے گی کھلی رہنے دو۔ دو کہتیں بلا سے
دھوپ سے تو جان بچے گی۔ سب عورتیں پریشان تھیں، چہرے اترے ہوئے
پسینے میں شرابور، ہونٹوں پر پپڑیاں جو کھڑی تھیں وہ بیٹھنے والیوں پر طعن و
طنز کر رہی تھیں جو بیٹھی تھیں وہ اترنے والیوں کی خوش قسمتی پر رشک کھا رہی
تھیں کھڑکی کے قریب والیاں بیچ میں بیٹھنے والیوں کو خوش قسمت سمجھتی تھیں
کہ دھوپ سے کچھ بچی ہوئی ہیں اور بیچ میں بیٹھی اور کھڑی عورتیں ان کو ہوا میں
بیٹھا دیکھ کر اپنی بدنصیبی کا گلہ کر رہی تھیں بچے والیوں کو "چھڑی عورتوں اور
لڑکیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ یہ کیوں بچے کی مصیبت سے بچی ہوئی ہیں۔ یہ احساس
شاید ہی کسی کو ہو کہ اس مصیبت میں سب ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہیں
درجے میں نسبتاً خاموشی طاری تھی۔

گاڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی کہ اسی میں اس نے پٹری بدلی۔ عورتیں
جھکولے کھا کر اور ایک دوسری پر گر کر سنبھلنے بھی نہ پائی تھیں کہ اوپر رکھا ہوا فولادی
ٹرنک ایک خوفناک آواز کے ساتھ نیچے بیٹھی اور کھڑی عورتوں پر آ پڑا۔ درجے
میں قیامت کبریٰ بپا ہو گئی۔ ہر عورت گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ کئی منٹ
تک عورتوں نے سوا چیخنے چلانے کے اور کچھ نہ کیا۔ آخر خود ٹرنک والی اور کونے کی

دونوں عورتوں نے بصد مشکل صندوق اُٹھایا۔ دو تین عورتوں کے معمولی سی چوٹیں اور خراشیں آئی تھیں لیکن ننھے بچے کی ادھیڑ ماں تو ٹرنک کے نیچے دب گئی تھی اور مسلسل اور بے تحاشا چلا رہی تھی۔ بہت سی عورتیں ٹرنک والی کو کوس اور گالیاں دے رہی تھیں۔ ادھیڑ ماں کو عورتوں نے اٹھایا۔ اس نے بدحواسی میں ادھر ادھر بچے کو ڈھونڈا وہ سیٹ کے نیچے کچلا ہوا پڑا تھا۔ ماں اپنی تکلیف بھول گئی اور جھپٹ کر بچے کو گود میں اُٹھایا تو معلوم ہوا کہ بچہ ختم ہو چکا ہے۔

چند لمحے کے لئے درجے میں بھیانک سناٹا چھا گیا سب ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے بدنصیب ماں کی فلک شگاف چیخوں نے خاموشی کے اس بھیانک طلسم کو توڑا اور سب نے اظہار افسوس کرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ ٹرنک والی کو لعنت ملامت کرنے کا مبارک کام بھی شروع کر دیا وہ غریب پریشان اور رنج و پشیمانی سے بدحواس کھڑی تھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ماں کچھ دیر تک مردہ بچے کو گلے سے لگائے بلکتی رہی۔ اس نے سر کے بال نوچ ڈالے تھے اور سر و چھاتی پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی کہ اتنے میں اس کی نظر ٹرنک والی پر پڑ گئی۔ بچے کی لاش کو دہیں چھوڑ چیل کی طرح جھپٹی اور جا کر اسے لپٹ پڑی" ڈائن، چڑیل، کم بخت"! اس کے منہ سے کوسنے اور گالیاں مسلسل نکل رہی تھیں۔ دوسری نے بمشکل گھٹی ہوئی آواز میں کہا" بہن میرا بھلا اس میں کیا قصور؟ ماں نے اس کا منہ پکڑ کر نوچ ڈالا اور بھیانک آواز میں چلائی:" ہاں ہاں تیرا کیا قصور، منحوس ڈائن تیرا کیا قصور؟ چڑیل تو میرے بچے کو ہائے اکلوتے

تجھے میرے لال کو کھا گئی۔ میرے لاڈلے کو نگل گئی جب تیرا یہ سپولیا مرے، تیرے
کلیجے میں بھی وہی آگ لگے جو میرے لگی ہے تب تجھے معلوم ہو تب میرے کلیجے میں
ٹھنڈک پڑے" یہ سُن کر خوبصورت بچے کی ماں نے بے اختیار اپنے بچے کو زور سے
گلے سے لپٹا لیا۔ دو چار عورتوں نے بیچ بچاؤ کرنا چاہا مگر دیوانی ماں نے جھٹکا دے کر
سب کو ہٹا دیا سب عورتیں بد حواس اور دم بخود تھیں کہ کیا کریں۔ ٹرنک والی کا
خوبصورت چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی گاڑی کسی دریا
کے پل پر سے گزرنے لگی۔ بدنصیب ماں جھپٹی۔ ٹرنک والی کے بچے کو پوری قوت سے
ماں کے گلے سے چھڑا کر چھین لیا اور قبل اس کے کہ دوسری عورتیں یا خود ماں بچے
کو واپس لیں یا یہ سمجھ سکیں کہ یہ کیا کرنے والی ہے، وہ عورتوں کے سروں پر سے
چھلانگ لگا کر دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ بچے کو کھڑکی سے باہر نکال کر پوری
قوت سے اچھال کر دریا میں پھینک دیا!!

دو تین عورتوں نے بڑی مشکل سے خطرے کی زنجیر پکڑ کر کھینچی۔
خوبصورت، ہنس مکھ اور تندرست بچے کی نوجوان ماں نے کھڑے کھڑے دو تین
ہچکولے کھاتے اور غش کھا کر گر پڑی مگر لاشے گرنے کی بھی جگہ نہ تھی دو تین عورتوں
کے اوپر پڑی تھی گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی جا رہی تھی دیوانی
ماں قہقہے لگا رہی تھی بھیانک مسلسل بے تحاشا

(چمنستان)

للی یا سرلا

پریم داس تھا تو دہلی کے قریب ہی کا رہنے والا لیکن ایک عرصہ سے اس کے
پتا نوکری کے سلسلے میں بھاولپور میں رہتے تھے اس کی ایک بہن اور دو بھائی تھے
بڑا بھائی مڈل کرنے کے بعد ریاست ہی میں نوکر ہو گیا تھا۔ منجھلا تجارت کے کام
میں لگا ہوا تھا۔ پریم بچپن ہی سے شریر، خود سر اور بہت ضدی تھا۔ اسی سال
اس نے ایم اے پاس کیا تھا لیکن اس تعلیم کے لئے جو جو پاپڑ اسے بیلنے پڑے تھے کچھ
پریم کا دل ہی جانتا تھا۔ دسویں پاس کرنے کے بعد سارا خاندان اس کے آگے
پڑھنے کا مخالف تھا کہ اب یا تو ریاست میں کوئی نوکری کر لو ورنہ منجھلے بھائی کے
ساتھ تجارت میں شریک ہو کر اس کا ہاتھ بٹاؤ اور منطق کا بنا یہ کہ اب ایشور نے کیا
سترہ اٹھارہ برس کی عمر ہو گئی۔ جوانی کا زمانہ ہے شادی ہو جانی چاہیئے مگر ہٹ کا
پکا پریم کسی بات پر بھی راضی نہ ہوا۔ آخر پتا نے ناراض ہو کر کہہ دیا کہ میرے پاس
بے کار روپیہ نہیں کہ تمہاری لغویات پر ضائع کروں۔ آگے پڑھنا ہے تو مجھ سے کچھ نہ
مانگنا۔ اس پر تو پریم کو اور بھی ضد ہو گئی وہ وہاں سے چل دیا اور ٹیوشن کر کے پڑھنا

شروع کیا۔ اول درجے میں ایف اے پاس کر کے وظیفہ لیا۔ بی اے کے بعد ایم اے میں داخلہ لیا اور اسی سال ساری یونیورسٹی میں اول نمبر پر ایم اے میں کامیاب ہوا تھا۔ اب اس کے سارے خاندان کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں۔ اس کے والد تو بیٹے سے مایوس بھی ہو چکے تھے اور مرعوب بھی۔ دونوں بھائی بھی پریم سے کھنچے کھنچے اور اس کے مزاج سے خائف رہتے تھے۔ ہاں بھاوجوں سے اس کا خاصا میل تھا۔ ماں اب بھی کبھی کبھی اسے کسی نہ کسی طرح دبا لیا کرتی تھیں وہ بیچاری ضرورت سے زیادہ قدامت پرست دولت پرست اور صورت پرست واقع ہوئی تھیں۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کے لائق فائق بیٹے کی شادی کسی حسین اور مالدار لڑکی سے بہت جلد ہو جائے۔ لیکن پریم ذات پات کے بندھنوں کا مخالف اور دولت کی خاطر شادی کرنے سے سخت متنفر تھا۔

زمانۂ تعلیم میں یوں تو پریم کی اکثر لڑکوں اور پروفیسروں سے بے تکلف ملاقات تھی لیکن اسے سب سے زیادہ عقیدت اور محبت ایک نوجوان پروفیسر شانتی سروپ سے تھی۔ یہ تاریخ کے پروفیسر تھے (اور تاریخ پریم کا خاص مضمون تھا) روشن خیال زیرک، خوش طبع اور راست باز، لڑکوں سے مثل دوستوں کے ملتے اور پریم سے تو انھیں خاص طور پر انس تھا رفتہ رفتہ استادی شاگردی نے گہری دوستی کی شکل اختیار کر لی اور پریم کی فرصت کا سارا وقت شانتی سروپ کے ہاں گزرنے لگا

شانتی سروپ کا خاندان دہلی میں ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ اگرچہ

دولت میں اسے کوئی امتیاز حاصل نہیں تھا۔ لیکن شرافت، قناعت، قابلیت اور نیک
چلنی میں دور دور مشہور تھا۔ ان کے بزرگ ساٹھ ستر برس پہلے تک معمولی دال
آٹے ہلدی کی دکان کرتے تھے۔ مگر شانتی سروپ کے پردادا نے اپنے بیٹوں کو تعلیم
دلائی اور اب تین پشت سے اس خاندان کے اکثر افراد علمی کاموں میں منہمک
رہتے تھے۔ وہ منتہائے کمال محض ڈگریوں ہی کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے دل
میں علم کی سچی پیاس اور حقیقی لگن تھی یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ان کے خاندان میں کوئی
جاہل تھا ہی نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ تر لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ شانتی سروپ
اور ان کے چچازاد بھائی ستیش چندر تو یورپ جاکر بھی تحصیل علم کر آئے تھے۔
ستیش چندر نے بیرسٹری پاس کی تھی اور شانتی سروپ نے ڈاکٹری کی ڈگری

پریم داس کا جیسے جیسے شانتی سروپ سے میل جول بڑھتا گیا وہ ان کا
اور ان کے خاندان والوں کا روز بروز زیادہ گرویدہ ہوتا گیا۔ جس چیز نے اس
کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ ان کی سادہ زندگی، سلامت روی اور نیک
چلنی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ شانتی سروپ کا سخت سے سخت مخالف بھی
ان کے خاندان کے چال چلن پر حرف گیری نہیں کر سکتا تھا۔ پریم داس خود
سر اور آزاد طبع تھا اور چونکہ خاندان والوں سے اس کی ان بن رہتی تھی اس
لئے اس کی طبیعت بڑی حد تک محبت کی بھوکی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ محبت
کی یہ بھوک اسے غلط راستے پر ڈال کر بدراہ کر دیتی۔ بعض اوباش لڑکوں نے
اس کی اس حالت کو بھانپ لیا تھا اور اس کوشش میں تھے کہ اسے بھی اپنے
رنگ میں رنگ لیں۔ مگر شانتی سروپ کی صحبت اور ان کی پاکیزہ زندگی کی

مثال نے اسے تباہی کے اس گڑھے میں گرنے سے بچا لیا۔ اگرچہ اس کی خودسری اور ضد اب بھی موجود تھی مگر دنیا سے جو بیزاری اور انسان سے نفرت اسے ہو گئی تھی وہ غائب ہو چکی تھی اور اس نے شانتی سروپ کا اثر قبول کر لیا تھا اگرچہ بعض باتوں میں وہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سروپ پرانی ہندوستانی تہذیب کے دلدادہ، بزرگوں کا احترام کرنے اور ان کا حکم ماننے والے تھے۔ پریم ان دونوں باتوں کو ناپسند کرتا تھا وہ کہتا تھا والدین قابل احترام سہی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہمارے جائز حقوق بھی ہم سے چھین لیں اور ہر وقت ہماری آزادی میں روڑا اٹکائیں سروپ عورتوں کو مناسب حد تک آزادی اور اعلیٰ تعلیم دینے کی حامی تو ضرور تھے مگر مغربی سوسائٹی میں ان کا تیتری بن کر رہنا، مردوں سے بے وجہ اور بے جا میل جول اور ہر بات میں مغرب کی نقالی کے بہت مخالف تھے۔ پریم کہتا تھا کہ ہمارے وطن کی ترقی اور ہماری آزادی کا انحصار ہی اس پر ہے کہ ہماری عورتیں بھی مثل مردوں کے ہر قسم کے کاموں میں ان کے دوش بدوش حصہ لیں اور ان کو پوری پوری آزادی دی جائے غرض ان ضمنی باتوں میں وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ ویسے ان میں سگے بھائیوں سے زیادہ یک جہتی اور محبت تھی۔

عرصے سے پریم اپنی شادی کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا مگر اس کا دل کہیں نہیں ٹھکتا تھا۔ اپنے اور اپنے جیسے خاندانوں پر غور کرتا تو اسے جاہل دلوکھسو یا، بدزبان، پھوہڑ اور بدتمیز لڑکیاں نظر آتیں، عام تعلیم یافتہ طبقے

پر نظر ڈالتا تو وہاں اسے ضرورت سے زیادہ فیشن پرستی فضول خرچی اور سطحی مذاق اور مغرب کے پست طبقے کی نقال لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ لے دے کر اگر اس کی نظر انتخاب کسی پر جا کر رکتی تھی تو وہ شانتی سروپ کے خاندان پر۔ ان کی بھتیجی سرلا کو اس نے دیکھا تو نہیں لیکن اس کی بابت سنا ضرور تھا کہ ذہین۔ سمجھدار، پڑھی لکھی اور خوبصورت لڑکی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جس خاندان کے مرد اس قدر تہذیب یافتہ اور صالح ہیں اس کی لڑکیاں کہاں تک اپنے مردوں سے مختلف ہوں گے۔ لیکن یہاں بھی اس کی فطری نکتہ چینی اسے فیصلہ نہیں کرنے دیتی تھی۔ وہ سوچتا کہ جب یہ لوگ خود قدامت پسند ہیں تو ان کی عورتیں اور بھی زیادہ پرانے خیالات کی ہوں گی اس کی آرزو تھی کہ میری بیوی اتنی آزاد خیال ہو کہ میرے دوستوں سے میل ملاقات کرے، وطن اور قوم کی بہبودی کی کوشش کرے، عورتوں کی لیڈر بنے اور پردے اور چادر کے پھندے سے آزاد ہو۔ غرض شیخ چلی کے سے پلاؤ پکاتا رہتا تھا۔ دراصل اس کی طبیعت اس قدر بے چین اور نکتہ چین واقع ہوئی تھی کہ اسے ہر ایک میں عیب ہی عیب دکھائی دیتے تھے لیکن پھر کہیں نظر انتخاب ٹھہرتی تھی تو ہر پھر کر سروپ کی بھتیجی اور ستیش چندر کی بیٹی سرلا پر۔

پریم نے اپنی بوڑھی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے کہا۔ "ماں جی میں پنڈت رام چندر کی ہاں ہرگز ہرگز بیاہ نہیں کروں گا۔" ماں جی نے حیرت سے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو پھاڑ کر بڑا کرنے کی ناکام کوشش

کی ”بیٹا تجھے ہو کیا گیا ہے کہیں اس پڑھائی نے دشمنوں کے دماغ میں کچھ خرابی تو نہیں پیدا کر دی؟ ارے ایسی اچھی نسبت قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتی ہے بیٹا ہمارے تو نصیب جاگ گئے کہ اتنی بڑی جگہ سے تیرے لئے پیام آیا جبر بھی ہے پنڈت جی لاکھوں کے آدمی ہیں لاکھوں کے!“

”وہ لاکھوں کے نہیں کروڑوں کے آدمی ہوں مجھے کیا۔ میں روپیہ سے تو بیاہ نہیں کروں گا۔“

”کیوں بیوی کے ساتھ ایشور دھن بھی دے تو کیا برائی ہے۔ تو کیا جانے روپیہ کی قدر۔ جب دنیا سے سابقہ ہوگا تو دولت کی قدر معلوم ہوگی۔ دنیا میں جو کچھ عزت ہے دولت ہی کی ہے۔“

”مجھے اگر روپیہ کی قدر ہوئی بھی تو یہ کبھی گوارا نہیں کروں گا کہ کسی مالدار لڑکی سے بیاہ کر کے بیوی کے پیسے سے عیش کروں۔ اگر روپیہ پیدا کروں گا تو اپنے قوت بازو سے ورنہ فاقہ کر لوں گا۔ لیکن اس کی خاطر دوسرے کا گلا نہ دباؤں گا۔“

”ارے بھائی گلا دبانے کا کیا ذکر۔ پنڈت جی کی تو دلی آرزو ہے کہ تیرے ساتھ چمپا کا بیاہ ہو۔ لاکھوں کے جہیز الگ اور پچاس ہزار روپیہ نقد دینے کو کہتے ہیں!!!“

”ماں جی تم بار بار میرے سامنے روپیہ کا ذکر نہ کرو۔ ان کی آرزو کے لئے میں اپنی زندگی کیسے خراب کر دوں!“

”زندگی کیوں خراب ہونے لگی۔ پنڈت جی اچھی سے اچھی نوکری دلوا

دیں گے۔ پھر لڑکی ایسی موہنی شکل کی ہے بس کیا کہوں۔ تم نے چمپا کو دیکھا ہے
"جی ہاں دیکھا ہے۔ آپ تو سمجھتی ہیں کہ بس دولت اور صورت دو ہی چیزیں لڑکی میں دیکھنی چاہیئے۔"
"واہ سب سے پہلی چیز جو دیکھی جاتی ہے وہ تو ذات ہے سو کون نہیں جانتا کہ پنڈت جی سب سے اونچے درجے کے برہمن ہیں۔"
"خیر ذات پات کی تو مجھے پروا نہیں۔ بلکہ اگر وہ برہمن کی جگہ شودر ہوتے تو میں شاید اس خیال سے راضی ہو جاتا کہ کسی طرح یہ ذات پات کی شرمناک رسم مٹے!!
"کیا بکتا ہے رمیو۔ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ اگر پنڈت جی کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو کبھی تیرا نام بھی نہ لیں گے۔ ان کی تو یہ شرافت کہ انھوں نے ہماری عزت کا بھی خیال نہ کیا۔ صرف لائق لڑکا دیکھ کر پیام بھیجا اور تیری یہ نالائقی کہ ان کی شان میں بیٹھا بے ہودہ بک رہا ہے۔"
"ماں جی اگر اس پر وہ ناراض ہو جائیں تو میں بہت خوش ہوں گا خیر یہ تو بتایئے کہ داماد تو وہ پڑھا لکھا چاہتے ہیں پر لڑکی کو بھی کچھ تعلیم دی ہے؟"
"یہ کون سی ایسی بات ہے سب ہی چاہتے ہیں کہ لڑکا پڑھا لکھا ہو آج کل مرد پڑھا لکھا نہ ہو تو کمائے گا کیا خاک۔ لڑکی کا کیا ہے اسے گھر کا کام کرنا ہوتا ہے کوئی سرکاری نوکری تو نہیں کرنی ہوتی۔ گھرداری ساس سسر کی عزت اور پتی کی سیوا کرنا ہی کنیا کا دھرم ہے اور یہی چیزیں اس میں دیکھی جاتی ہیں۔"

"خیر تعلیم کے مقصد کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا تو بے کار ہے مگر کیا اتنا پوچھ سکتا ہوں کہ جو اوصاف آپ نے عورت کے گنائے وہ چمپا میں ہیں؟"

"ہاں ہاں جو باتیں شریفوں کی لڑکیوں میں ہونی چاہئیں سب ہیں۔"

"بس رہنے دیجئے یہ اس سے کہیئے جو جانتا نہ ہو الف کے نام لٹھ وہ نہیں جانتی مزاج کا وہ حال کہ محلے والے تک پناہ مانگتے ہیں، نوکر تو خیر جان ہی سے بیزار رہتے ہیں۔ غرور کا یہ عالم کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتیں اور گھر کا کام کاج، ساس سسر کی عزت اور پتی کی سیوا تو وہ جیسی کچھ کریں گی آپ بھی جانتی ہیں۔"

"اسے کام کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس اکیلی پر چار چار نوکر ہیں۔ بیٹا نازوں کی پلی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ کوئی بھک منگے گھر کی نہیں امیر زادی ہے امیر زادی۔"

"تو پنڈت جی سے کہیے کسی نازوں کے پلے امیر زادے سے بیاہ کریں۔ جس پر دس دس نوکر ہوں میں بچارا ان کے مزاج کیسے اٹھاؤں گا۔"

"تو یوں کیوں نہیں کہتا کہ میں کرنا ہی نہیں چاہتا کسی کی کنواری کنیا میں عیب کیوں نکالتا ہے۔"

"میں تو عیب نہیں نکالنا چاہتا تھا آپ نے چھیڑ چھیڑ کر کہلوایا میں تو شروع ہی میں کہہ چکا تھا کہ میں وہاں شادی نہیں کروں گا۔"

"تیرے پتا جی تو پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ کسی کی بات ماننے والا نہیں تم اس سے کہہ کر اپنے کو ذلیل نہ کرو۔ میں نے ہی اس گھمنڈ میں کہ میرا بیٹا میری

بات نہیں ٹال سکتا ان سے وعدہ کر لیا۔ اسی پڑھائی کی تعریف ہوتی ہے جس کے بعد اولاد ماتا پتا کی کوڑی برابر قدر بھی نہیں کرتی۔"

"آپ ہر بات میں تعلیم کو کیوں گھسیٹا کرتی ہیں۔ رہی آپ کی عزت وہ جتنی میرے دل میں ہے میں ہی جانتا ہوں لیکن شادی تو میرا ذاتی معاملہ ہے اس میں ماتا پتا کی عزت کا کیا ذکر آپ کیوں اس میں دخل دیں جہاں میرا جی چاہے گا کر لوں گا۔"

"آخر تیرا جی کہاں کرنے کو چاہتا ہے؟"

"ابھی تو میں نے طے نہیں کیا جب فیصلہ کروں گا بتا دوں گا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تو کسی بنیئے کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔"

غصہ سے "کس سے سُنا؟ کون بنیا؟"

"بنیا اور کون ہوتا وہی نگوڑا شانتی سروپ۔"

بہت ضبط کر کے "نہ تو شانتی سروپ بنیئے ہیں اور نہ ان کے کوئی لڑکی ہے۔"

"بنیا نہیں تو اور کون ہے میں تو اس کی سات سات پشت سے واقف ہوں۔ اب چار حرف پڑھ کر بڑے بڑے عہدے پانے لگے تو کیا ہوا، ہے تو بنیا ہی اس کے دادا پردادا سب بنیئے تھے۔"

"خیر بنیئے ہی سہی بنیا ہونا کوئی عیب تو نہیں۔"

"ہے ہے تو کیا برہمن کے گھر بنیئے کی بیٹی آئے گی؟ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر یہ نہیں برداشت کر سکتی۔ خبردار جو ادھر کا خیال کیا۔"

"یہ ہے تو یہی سہی۔ برہمن کی بیٹی آسمان کی اپسرا بھی ہو گی تو میں اس سے بیاہ نہیں کروں گا۔ کروں گا تو کسی بنیے یا چھوت کی لڑکی سے۔"

"تو یوں کیوں نہیں کہتا کہ تو اس بنیے کی لڑکی سے وعدہ کر آیا ہے باتیں کیوں بناتا ہے۔"

"ماں جی میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نہ میں نے کسی سے وعدہ کیا ہے نہ ان کے کوئی لڑکی ہے آپ خواہ مخواہ کسی کو بدنام نہ کیجئے۔"

"لڑکی نہ ہو گی بہن ہو گی۔ بھتیجی، بھانجی ہو گی۔ کوئی ہو مگر اس خاندان میں تیرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔"

"اگر آپ کو یہ ضد ہے تو مجھے بھی ضد ہو گئی۔ اب تک تو اس کی کوئی اصلیت نہ تھی مگر اب میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اسی خاندان میں شادی ہو گی۔"

"غیر گھرانے کی کم ذات بہو میرے گھر میں نہیں آ سکتی۔"

"بہت خوب وہ آپ کے گھر میں نہیں آئے گی جب میں اپنا گھر بنا لوں گا تب شادی کروں گا۔ میری تعلیم کے معاملے میں بھی سب نے یونہی رکاوٹیں ڈالیں پتا جی نے روپیہ دینا بند کر لیا۔ ایشور کی کرپا سے میں نے بغیر کسی سہارے کے بھی پڑھ ہی لیا۔ بلکہ زیادہ محنت اور شوق سے پڑھا۔ اب آپ لوگ ایک بد تمیز جاہل اور مغرور لڑکی کے ساتھ میری قسمت پھوڑنا چاہتے ہیں لیکن یہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور یہ تو مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ میری کوئی خواہش یا خوشی آپ لوگ پوری کرنا نہیں چاہتے۔" یہ کہہ کر پریم غصے میں بھرا ہوا باہر جا کر اپنا اسباب باندھنے لگا۔

شانتی سروپ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے اس کیمرے کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ جو ابھی چند دن ہوئے انھوں نے خریدا تھا۔ تصویر کشی کا انھیں خاص ذوق اور بہت شوق تھا وہ فرصت کا بہت سا وقت اس شغل میں صرف کیا کرتے تھے۔ سامنے سے پریم اپنا اٹیچی کیس ہاتھ میں لئے آتا نظر آیا اور وہ کیمرہ چھوڑ چھاڑ دوڑ کر پریم کے گلے سے لپٹ گئے "ارے بھائی تم اس وقت کہاں سے نازل ہو گئے مجھے تو گمان بھی نہیں تھا کہ دو مہینے سے پہلے تم دہلی میں قدم رکھو گے۔ بھئی میں اس وقت دل میں تمھیں یاد ہی کر رہا تھا۔"

"واہ حضرت یہ کیمرا لئے میری یاد ہی تو ہو رہی تھی؟ شاید عالم تصور میں میری تصویر کھینچ رہے ہوں گے۔"

بھلے آدمی یہ تو پوچھا ہوتا کہ کس لئے تمھاری یاد آ رہی تھی۔ بتاؤ تو میں کس وجہ سے تمھیں یاد کر رہا تھا۔"

"کوئی نئی تصویر دکھانی ہوگی۔"

"غلط۔ تم جیسے ناقدرشناس کو میں اپنی تصویریں کیوں دکھانے لگا۔"

"تو پھر کیوں یاد فرما رہے تھے۔"

"مٹھائی کا وعدہ کرو تو بتاؤں۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ نے شادی کر لی ہے۔"

"یہ خوب رہی۔ شادی کر کے مٹھائی کھلاؤں گا یا تم سے کھاؤں گا۔"

"اگر آپ شادی کر لیں تو جتنی مٹھائی کہیں میں کھلانے کو تیار ہوں۔"

"خیر چھوڑو اس قصہ کو یہ بتاؤ آگرہ کالج میں جو درخواست تم نے دی

تھی اس کا کیا ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا مجھے تو پہلے بھی امید نہیں تھی اور اب تو بالکل نا امیدی ہو گئی۔"

"پھر آخر تم نے اپنے لئے کیا سوچا ہے؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں سوچا۔ آپ سے مشورہ لینے آیا ہوں۔ پیسہ میرے پاس بالکل نہیں۔ ایک دو مہینے بھی بغیر کام کئے گزارا مشکل ہے۔"

"اس قدر جلد کیا کام مل سکتا ہے؟"

"اور کچھ نہ ملے گا تو مزدوری تو کہیں نہیں گئی۔"

"گویا مزدوری کا ملنا بڑا آسان ہے؟ اور آپ سے مزدوری ہو گی؟ ذرا آئینہ میں اپنی شکل تو دیکھو۔ تم کالجوں کے پڑھے ہوئے لڑکے چوری کر سکتے ہو پر مزدوری نہیں۔ مزدوری کرنے کے لئے بڑے جیوٹ کی ضرورت ہے۔"

"یہ کیا کہا آپ نے؟ کیا ہم اس قدر بودے اور بے حیا ہے۔ وقت پڑنے پر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں کل ہی آپ مجھے چاندنی چوک میں یا اسٹیشن پر بوجھ ڈھوتے دیکھ لیجئے گا۔"

"بہت خوب تو تار دے کر تمہارے والد کو بھی بلا لوں کہ وہ بھی اپنے سپوت کی کارگزاری ملاحظہ فرمالیں۔"

"اصول کے معاملے میں میں پتا جی کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اول تو مزدوری کرنا کوئی عیب نہیں اور اگر ہو تو اس میں میری بے عزتی ہے انھیں اس سے کیا مطلب؟"

"تم تو مذاق میں بگڑے جاتے ہو کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو۔"

"جی ہاں کل ہی ماں جی سے جھڑپ ہوگئی اور اب میں ہمیشہ کے لئے وہاں سے چلا آیا ہوں۔"

"خیر یہ تو کوئی نئی بات نہیں اکثر تم وہاں سے ہمیشہ کے لئے چلے آئے ہو اور پھر کھنچے چلے گئے ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ماں جی کی محبت کی کشش اکثر کھینچ لے گئی ہے۔ مگر یہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ میں گیا ہوں۔ تب بھی اپنے اصول کو نہیں توڑا ہے۔"

"کیا کہنے ہیں تمھارے اصولوں کے۔ سارے اصول ماں باپ ہی پر آزمائے جاتے ہیں۔ خیر اس کو تو جانے دو مگر وہ مٹھائی کھلانے کا قصہ تو رہ ہی گیا تو کب کھلاؤ گے۔"

"پھر وہی مٹھائی کیا آپ آج فاقے سے ہیں۔"

"نہ سہی میں بھی وہاں کسی اور کو بھیج دوں گا۔"

"کہاں۔"

"آگرہ کالج۔" "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمھاری درخواست منظور ہوگئی۔ تم وہاں لکچرر مقرر ہوگئے دو سو تنخواہ ہے۔ مہینہ بھر میں جا کر چارج لے لینا ہوگا۔"

پریم نے محبت اور گرم جوشی سے سردپ کا ہاتھ دبایا خوشی اور ممنونیت کے جوش سے اس کی آنکھیں آنسوؤں ہوگئیں۔ "یہ سب آپ کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"

مجھ سے کیا واسطہ۔ میں تو چاہتا تھا کہ تمھیں یہ جگہ نہ ملے اور تم میرے پاس دہلی رہ کر نوکری ڈھونڈو۔ مگر خدا سمجھے ان کو جنھوں نے تمھارا تقرر کر دیا۔"

"واقعی بات تو یہی ہے۔ اب چائے وائے پلوانے کا ارادہ ہے یا نہیں؟"

"ارے میں تو باتوں میں بھول ہی گیا۔ بنسی او بنسی جلدی سے چائے اور ناشتہ کے لیے کچھ چیزیں لا۔ اور دیکھ ہم شام کو دیر سے آئیں گے۔ فلم دیکھ کر، کیوں پریم رنگل میں گڑیا گارلوہ فلم آیا ہوا ہے۔ چلتے ہو؟"

"ضرور نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

رات کا وقت ہے۔ چمبیلی، موتیا اور رات کی رانی کی خوشبو سے سارا باغیچہ معطر ہو رہا ہے۔ سارے دن کی شدید گرمی کے بعد اس وقت ہوا میں قدرے خنکی اور نرمی آئی ہے۔ شانتی سروپ اور پریم دونوں باہوں میں باہیں ڈالے آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہے ہیں۔ سروپ کوئی شعر گنگنا رہے ہیں لیکن پریم کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ شانتی سروپ نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا۔ "پریم کیا بات ہے چپ کیوں ہو؟" پریم کچھ دیر چپ رہا پھر بولا "سروپ میں آپ سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" "بڑے شوق سے۔"

"لیکن میری ہمت نہیں پڑتی۔"

کیا ہمارے درمیان اب تک کوئی غیریت باقی ہے جو کسی مسئلے پر گفتگو کرنے میں جھجک ہو۔"

"غیریت تو نہیں مگر مجھے خوف ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

" ایسی ہی تو تمھیں میری ناراضگی کی پرواہ ہے اس قدر بنتے کیوں ہو۔ کہتے کیوں نہیں کیا بات ہے ؟"

" اگر آپ کو میری بات سے اختلاف ہو تو بغیر میرا خیال کئے صاف صاف کہدیجئے گا "

" میں اب تک نہیں سمجھا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو "

" دراصل میں اب اس یکساں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ سوچتا ہوں شادی کر لوں۔ شاید میری افسردگی اور بیزاری میں کچھ کمی ہو جائے "

" یہ تو بہت مناسب خیال ہے میں خود مدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمھاری شادی جلد ہونی چاہیئے تاکہ ایک محبت کرنے والی ہستی تمھاری تکمیل اپنے ہاتھ میں لے لے۔ مگر نسبت کہاں ٹھیری ہے ؟"

" کہیں نہیں۔ لیکن آپ مدد کریں تو ہو سکتی ہے "

" میں نے تو سنا تھا پنڈت رام چند کی لڑکی سے تمھاری منگنی ہونے والی ہے ؟"

" جی ہاں پتا جی اور ماں جی نے بجائے خود سب کچھ طے کر لیا تھا۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ اسی پر تو وہاں سے لڑ کر آیا ہوں "

" برا کیا انھیں پنڈت جی سے کس قدر شرمندگی ہوئی ہو گی "

" کیا خوب ؟ میں ان کی بات کی خاطر اپنی ساری زندگی تباہ کر لیتا۔ یونہی اتنی عمر کون شانتی سے کٹی ہے کہ یہ ساری عمر کی مصیبت گلے ڈال لیتا۔ ایسی جاہل۔ مغرور، زبان دراز لڑکی کے ساتھ تو فرشتے بھی نباہ نہیں کر سکتے۔ میں تو

نہایت خودسر اور مزاج دار آدمی ہوں۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے سنا ہے لڑکی بہت مغرور اور زبان دراز ہے۔"

"آپ ہی بتلایئے کیا کروں۔ امیروں کی لڑکیوں کا یہ حال۔ خاندان میں جاہل قدامت پرست، دلو گھسو لڑکیاں ہیں اور متوسط تعلیم یافتہ طبقہ میں مغرب پرستی فضول خرچی، سطحی مذاق اور اوپری ملمع نظر آتا ہے۔"

"تب تو تمھاری شادی ہونا بہت مشکل ہے۔ ہر جگہ نقص نکالو گے تو کیسے کام چلے گا۔"

"آپ مدد کریں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

"میری مدد سے؟ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میری سفارش کام آسکتی ہو تو میں خوشی سے تیار ہوں۔"

"دیکھئے بات یہ ہے —— میں کہتے ہوئے ذرا گھبراتا ہوں —— دراصل میری حیثیت اور حالت اس قابل نہیں کہ اس جگہ کے لئے درخواست دوں —— یعنی میرا مطلب یہ ——"

"صاف صاف کیوں نہیں کہتے اس قدر ایچ پیچ کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں سرلا دیوی کے لئے پیام دینا چاہتا ہوں۔"

"شانتی سروپ ایک لمحے کے لئے چونکے اور پھر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پریم بے تابی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔" اگر آپ یا ستیش چندر صاحب مجھے اس قابل نہ سمجھیں تو بلا تکلف مجھے بتا دیجئے —— مجھ جیسے کم حیثیت شخص کا سرلا کے لئے پیام دینا بہت بڑی جرأت ہے لیکن انسان خود غرض ہوتا ہے

اور محض درخواست پر غور کرنے میں تو بیرسٹر صاحب کو بھی شاید کوئی اعتراض نہ ہو۔"

"پریم تم نے اس وقت ایسی بات کہی جس کا مجھے گمان بھی نہیں تھا۔ اس لئے فوراً کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔"

آپ اطمینان سے غور کر کے مجھے اپنی رائے بتا سکتے ہیں۔"

"مجھے تو غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں لیکن چند وجوہ ایسے ہیں جن کی وجہ سے دوسروں کو اعتراض ہوگا" پریم نے سوالیہ نظروں سے سروپ کو دیکھا۔

"ایک تو غالباً تمھارے والدین اس رشتہ کو پسند نہیں کریں گے۔ ہمارے ہاں ابھی اتنی وسعتِ خیال پیدا نہیں ہوئی کہ ذات پات کا خیال چھوڑ دیا جائے۔"

"یہ تو آپ درست کہتے ہیں میرے والدین کی تو دلی آرزو ہے کہ کوئی بدزبان جاہل پھوہڑ لڑکی میرے سر منڈھ کر میری زندگی برباد کردیں۔ مگر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے میں ان کے حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔"

"لیکن لڑکی والے عموماً یہ چاہتے ہیں کہ لڑکے کے بزرگوں کی طرف سے درخواست کی جائے تاکہ لڑکی کو سسرال میں بے وقعتی کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے ستیش بھائی کو نہ بھی ہو پر بھابی کو اس پر ضرور اعتراض ہوگا۔"

"مجھے اس سے اختلاف ہے۔ لڑکی والوں کو میرے متعلق اطمینان کرنا چاہیئے میرے والدین سے اس معاملے سے کیا تعلق۔ شادی کے بعد بیوی کا واسطہ

مجھ سے رہے گا ان سے نہیں۔ پھر خاندان والوں سے میری اب بھی نہیں بنتی اور شادی کے معاملے میں سخت جھڑپ ہو چکی ہے آپ یہ بات بالکل صاف کر دیجئے گا کہ اس معاملے میں نہ تو میں والدین کو درمیان میں ڈال سکتا ہوں اور نہ ڈالنا چاہتا ہوں۔ میری تو دلی خواہش یہ تھی کہ میں خود سرلا دیوی سے درخواست کرتا مگر آپ کے ہاں کی بندشیں اور رسمیں اس کی منافی ہیں۔"

"اگر تم اس قدر آزاد خیالی چاہتے ہو تو ادھر کا خیال چھوڑ دو۔ نہ تو بھائی صاحب اور بھابی اتنے آزاد خیال ہیں اور نہ سرلا کی تعلیم اور تربیت اس قسم کی ہوئی ہے کہ وہ اس بات کو گوارا کرے گی۔"

بات میں بات نکلتی چلی آئی۔ پریم کو بحث کی عادت ہی تھی اور شانتی سروپ سے بے تکلفی بھی بہت تھی اور وہ ان سے آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔ چنانچہ خوب گرما گرم بحث چھڑ گئی اور تان ٹوٹی عورتوں کے پردے اور مردوں سے کھلم کھلا میل جول پر۔ شانتی سروپ اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کہتے عورتوں کو حقیقی آزادی دو۔ ان کے خیال، دماغ اور دل پر سے بندشیں اتار اس سطحی اور دکھاوے کی آزادی سے کیا ہوتا ہے۔ یہ آزادی نہیں پابندی ہے، مردوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر ناچنا ہے پہلے عورت کو گڑیا بنا کر طاق پر سجایا اب چاہتے ہو کہ وہ تیتری کے بھیس میں چمن میں اپنی رنگینی دکھاتی اور پھولوں کا رس چوستی پھرے۔ اس کا مقصد عورت کو آزادی دینا نہیں بلکہ اس کی نمائش کر کے اپنی انانیت کو تسکین دینا ہے، اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے بیوی کو سوسائٹی کی ملکیت بنانے سے آزادی اور روشن خیالی کہاں سے

آجاتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ حد درجہ غیر فطری اور بے جا خیال ہے اور
ہندوستان کی تہذیب تمدن اور رسم و رواج کے بالکل منافی۔ پریم کہتا جس
عورت کو پوری پوری آزادی نہ ہوگی وہ دنیا میں کچھ کر ہی نہیں سکتی وہ قوم
اور ملک کی خدمت تو کجا اپنا بار بھی نہیں اٹھا سکتی، اپنے گھر کی ذمہ داریوں
بچوں کی مناسب پرورش، مریض کی تیمارداری کچھ بھی تو وہ اچھی طرح نہیں
کر سکتی۔ کیونکہ اس کے دل و دماغ پر قدامت پرستی کی مہر لگی ہوتی ہے اور
اس کی آنکھوں پر اندھیری چڑھی ہوتی ہے۔ سروپ کہتے موجودہ زمانے کی
نمائشی اور سطحی تعلیم جو محض سوسائٹی کے آداب یا فیشن اور مغرب پرستی سکھاتی
ہے عورتوں میں عمل کی صلاحیت کس طرح پیدا کر سکتی ہے۔ ہمارے پرانے
زمانے کی جاہل خواتین بھی ضرورت کے وقت سب کچھ کر سکتی تھیں اور اس
زمانے کی لڑکیاں جنھیں عام مغربی تعلیم نہ بھی ملی ہو مگر مناسب دیسی تعلیم اور اچھی
تربیت ملی ہے جن کا مطالعہ وسیع اور خیالات پاکیزہ ہیں جن میں عمل کا جوش اور
خدمت کی لگن موجود ہے مشکل سے مشکل اور کٹھن سے کٹھن کام کر سکتی ہیں، کرتی
ہیں اور کریں گی۔ دو گھنٹے تک دونوں میں بحث ہوتی رہی لیکن قائل نہ وہ ہوتے
تھے نہ یہ۔ گیارہ کا گھنٹہ سن کر شانتی سروپ جانے کے لئے اٹھے اور پریم
سے چلتے چلتے کہا: "پریم یہ بات خوب سوچ لو کہ اگر بھائی صاحب نے تمہارا
پیام قبول کر لیا تب بھی وہ تمھیں سرا سے کورٹ شپ کی اجازت نہیں دیں
گے اور اس شرط پر تو پہلے ہی سے بھڑک جائیں گے کہ تم لڑکی کو شادی
کے بعد مجبور کرو کہ وہ اپنی عادت اور رواج کے خلاف بالکل "سوسائٹی وومن"

بن جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ رفتہ رفتہ تم لسے اپنا ہم خیال بنالو لیکن پہلے سے اس قسم کی شرط اس کے والدین قبول نہیں کر سکتے۔ تم اب بھی اس بات کو سوچ سمجھ لو کیونکہ معاملہ ابھی تک ہے پیام دینے کے بعد اس قسم کی باتیں نامناسب ہوں گی !!

یہ سن کر پریم چپ ہوگیا۔ وہ رات بھر اسی الجھن میں رہا۔ لیکن کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنا اس کے لئے بڑا مشکل تھا۔ موافق اور مخالف دلیلیں اس کے دماغ میں آتی تھیں اور وہ ان پر غور کرتا تھا آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جو ہوا اب تو وہ سرلا کو پیام دے چکا اس سے پھرنا نہیں چاہیئے۔ اور صبح کو اس نے اپنے فیصلہ سے شانتی سروپ کو مطلع کر دیا۔

تین ہفتے گزر چکے ابھی تک ستیش چندر نے پریم کے پیام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انھیں اس پر بہت سے اعتراض تھے وہ اس کی لا ابالی اور ضدی طبیعت سے خوف کھاتے تھے، اس کی خودسری اور آزاد خیالی سے ڈرتے تھے اس کی والدین کی ناراضگی کا بھی انھیں خیال تھا لیکن ساتھ ہی پریم کی قابلیت، ذہانت، شرافت اور نیک چلنی کے بھی معترف اور مداح تھے۔ سرلا کی ماں تو اس پیام پر شروع سے لٹو ہوگئیں تھیں اور سب سے زیادہ اس بات سے خوش تھیں کہ میری سرلا ساس سسرال کے بکھیڑوں سے الگ اور طعنے تشنوں سے محفوظ رہے گی اور اکیلی اپنے گھر پر حکمرانی کرے گی غالباً بچاری کو اپنے تلخ تجربات یاد آتے تھے۔ لیکن ستیش چندر کا خیال تھا کہ خاندان سے الگ تھلگ رہ کر کوئی

خاص خوشی انسان محسوس نہیں کرسکتا۔ شانتی سروپ پریم کے بغیر فیس کے وکالت کررہے تھے اور ستیش چندر کے اعتراضوں کے جواب دیتے اور انھیں قائل کیا کرتے تھے۔

آج پریم آگرہ روانہ ہونے والا تھا اور مُصر تھا کہ ہاں یا نہیں جو جواب ملنا ہے آج ہی مل جائے۔ بارے سرلا کی ماں اور شانتی سروپ کے اصرار پر ستیش چندر نے منظوری دیدی لیکن ساتھ یہ شرط لگادی کہ شادی سال بھر بعد کروں گا اور اس عرصے میں اگر کوئی نامناسب بات دونوں میں سے کسی ایک فریق کو بھی معلوم ہو تو وہ نسبت چھڑا لینے کا مجاز ہوگا۔

پریم داس اس پر بہت چراغ پا ہوا لیکن شانتی سروپ نے سمجھایا کہ بھائی صاحب کے مزاج میں شک ہے اس لئے انھوں نے یہ شرط رکھی ہے لیکن تم مجھ پر بھروسا رکھو اس کی نوبت نہ آئے گی اور تم بھی سال بھر میں اپنا گھر بار درست کرلوگے۔ کچھ مالی حالت ٹھیک ہوجائے گی۔ تاکہ ایک دوسری ہستی کا بوجھ اٹھا سکو۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا مناسب نہیں۔ یہ معقول بات سن کر پریم لاجواب ہوگیا۔ وہ اسی دن شام کو آگرہ روانہ ہوا۔ سرلا کی ماں نے بہت سا ناشتہ اور مٹھائی ساتھ کی اور شانتی سروپ کے علاوہ ستیش چندر اور سرلا کا بھائی سریش اسٹیشن تک اسے پہنچانے آئے۔

دسمبر کی چھٹیاں گزر چکی تھیں۔ جنوری کی پہلی تاریخ تھی۔ شانتی سروپ ہفتے بھر سے پریم کے منتظر تھے کہ آج اس کا خط ملا "میری صحت ٹھیک نہیں

تھی۔ ایک دوست کے اصرار سے چھٹیاں گزارنے ان کے گاؤں آصف آباد آگیا ہوں۔ یہ جگہ فرید آباد سے آٹھ دس میل پر ہے۔ آپ کو موقع ملے تو دو ایک دن کے لئے ضرور آئیے۔" شانتی سروپ کو بہت غصہ آیا ہم دس دن سے انتظار کر رہے ہیں اور اب یہ خط آتا ہے بس کچھ نہیں اس کی ناک ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔ اب رشتہ ہو گیا سو چاہو گا سسرال جانا میری سبکی ہے احمق۔ بے وقوف۔

وہ دل ہی دل میں پریم کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ تار کے چپراسی نے سامنے آکر سلام کیا اور ایک تار ان کے ہاتھ میں دے دیا۔" پریم سخت بیمار ہے ڈاکٹر کو لے کر فوراً آئیے۔ ریاض۔" ریاض شانتی سروپ کا شاگرد اور پریم کا دوست اور ہم جماعت تھا۔ تار پڑھ کر شانتی سروپ بدحواس ہو گئے گھبراتے ہوئے ستیش چندر کے ہاں گئے۔ ان سے حال کہا۔ انھوں نے کہا میں تو جا نہیں سکتا۔ تم سرلش کو لے کر فوراً چلے جاؤ۔ اپنی کار میں چلے جانا وہ چھوٹی ہے پٹرول کم خرچ ہو گا۔ میرے پاس سے بھی کوپن لے لینا۔ سرلا کی ماں بھی پریشان ہو گئیں اور دعائیں مانگنے لگیں۔ سرلا نے محض اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ایک مرتبہ چچا کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ سروپ پر اس کی اس ایک نظر کا بہت اثر ہوا۔ وہ سرلش اور ڈاکٹر کو لے کر فوراً آصف آباد روانہ ہو گئے اور دو گھنٹے میں وہاں جا پہنچے یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ریاض کے والدین شہر میں رہتے تھے صرف ریاض اور پریم تبدیل آب و ہوا کی غرض سے یہاں آگئے تھے ایک بوڑھا باورچی ان کے علاوہ تھا۔ پریشان ریاض ان کا منتظر ہی تھا۔ جلدی

سے سب کو اندر لے گیا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں پلنگ پر پریم بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے دیکھ بھال کر نمونیہ تشخیص کیا۔ نسخہ لکھا انجکشن دیا۔ ہدایات دیں اور تاکید کی کہ بہت احتیاط کے ساتھ تیمارداری کی جائے۔ نرس کی سخت ضرورت ہے جیسے ہو ایک ٹرینڈ نرس ضرور رکھ لی جائے۔ شانتی سروپ نے سریش کو بھی ڈاکٹر کے ساتھ واپس دہلی بھیجا اور ستیش چندر کو پریم کی حالت اور ضرورت کی سب اشیاء وغیرہ لکھ دیں کہ بھیج دیجئے۔ اور تاکید کی کہ کسی نرس کو تلاش کرکے لے کر آئیے۔ ڈاکٹر اور سریش دہلی گئے اور یہاں ریاض اور شانتی سروپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ نہ بخار کم ہوتا تھا نہ ہوش آتا تھا اور سانس تھا کہ بس اوپری اوپر آتا معلوم ہوتا تھا۔ اگلے دن شام کو ستیش چندر دوائیں لائے اور ڈاکٹر کو بھی ساتھ لائے پریم کی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوئے بھائی سے کہا میں نے ساری دہلی چھان ماری جنگ کی وجہ سے یوں بھی نرسوں کی کمی ہو گئی ہے اور جو ہیں وہ آنے پر راضی نہیں۔ صرف ایک اینگلو انڈین نرس آنے پر تیار تھی مگر اس نے فیس سو روپے روز مانگی ...... ڈاکٹر نے دیکھ کر پھر اصرار کیا کہ نرسنگ عمدہ طور پر ہونا بہت ضروری ہے۔ ورنہ بچنا محال ہو جائے گا۔

بڑی دیر تک دونوں بھائی سوچتے رہے۔ سروپ نے ستیش کو الگ لے جا کر کچھ باتیں کیں اور بڑی دیر کی ردوکد کے بعد طے پایا کہ سروپ دوبارہ شہر جا کر نرس تلاش کرے اور اگر نرس نہ ملے تو جو مناسب سمجھے کرے رات کو ستیش چندر پریم کے پاس رہے اور سروپ شہر چلے گئے۔ اگلے دن دوپہر کو

سروپ واپس آصف آباد پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ شانتی سروپ نے ان الفاظ میں اس کا تعارف کرایا "آپ مس للی ہیں۔ نرسنگ بطور پیشہ کے نہیں کرتیں مگر جانتی ہیں۔ آپ نے بڑی عنایت کی کہ اس نازک وقت میں ہماری مدد کو تشریف لے آئیں۔ مس للی آتے ہی مریض کا سب کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تندہی سے تیمارداری میں مصروف ہو گئی۔ وہ چوبیس گھنٹے میں مشکل سے تین چار گھنٹے آرام لیتی تھی۔ مریض کا کھانا تک اپنے ہاتھ سے تیار کرتی۔ رات کو چند گھنٹے شانتی سروپ کے اصرار سے برابر کے کمرے میں جا کر سو رہتی تھی مگر پھر بھی ذرا سی آہٹ پر بیدار ہو کر آ جاتی۔ وہ اس سہولیت، سلیقہ اور سکون سے مشکل سے مشکل کام انجام دیتی کہ ریاض، سروپ اور خود پریم حیرت میں رہ جاتے تھے کہ ان نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں مشین کی سی پھرتی اور فولاد کی سی طاقت کیسے آ گئی؟ پریم اب ہوش میں تھا وہ حیرت سے مس للی کی ان تھک خدمت اور تیمارداری کو دیکھا کرتا۔ ڈاکٹر نے دس دن بعد کہا کہ اب مریض خطرے سے باہر ہے اور اعتراف کیا کہ مس للی کی اعلیٰ درجہ کی نرسنگ ہی نے ان کی جان بچائی ورنہ امید نہ تھی۔

پریم نے شروع بیماری ہی میں اپنی ماں کو اپنی بیماری کا خط لکھوایا تھا۔ بچاری ماں کی ماری اپنے بڑے پوتے کو لے کر آ گئی اس وقت تک پریم خطرے سے باہر ہو چکا تھا۔ ریاض ہندو رسوئیے کا انتظام کر کے آگرہ اپنی ملازمت پر چلے گئے۔ سروپ ایک دو دن کو دہلی جاتے تو ستیش چندر یا سریش آ جاتے

دم چلے جاتے تو سرد پ رہتے۔

پریم اگرچہ شانتی سرد پ اور ان کے خاندان والوں کی محبت اور خدمت کا دل سے معترف تھا مگر اس سے بھی زیادہ مس للی کی تیمارداری، سلیقہ، شرافت اور متانت کا مداح بلکہ گرویدہ ہو گیا تھا۔ ماں جی نے شروع میں اس عیسائن کو دیکھ کر بہت ناک بھوں چڑھائی۔ لیکن آہستہ آہستہ عیسائن کی خوبیوں نے ان کے دل میں گھر کر لیا۔ اول تو انھیں موم کرنے کو یہ چیز ہی کافی تھی کہ یہ غیر لڑکی کس محنت سے دن رات ایک کر کے میرے بچے کی خدمت کر رہی ہے اور پھر تیمارداری سے جو وقت بچتا وہ للی ماں جی کی خدمت میں گزارتی۔ کبھی ان کے سر میں تیل لگا کر سر گوندھتی، کبھی کتابیں پڑھ کر سناتی اور کبھی پیر دبا دیتی۔ ماں جی تھیں کہ اس کی تعریف کرتے کرتے دہری ہو جاتی تھیں۔ کبھی ان کی سگی بہوؤں نے بھی ان کی اس طرح خدمت اور خیال نہ کیا تھا اور بیٹی تو بے چاری کے تھی ہی نہیں۔ پریم اکثر سرد پ سے مس للی کی تعریفیں کرتا جس پر وہ ذرا ناگواری سے کہتے اس کا کام ہی یہ ہے۔ معاوضہ بھی تو تیمارداری اور خدمت ہی کا لیتی ہیں اس میں تعجب یا احسان مندی کی کونسی بات ہے پریم حیران ہو کر کہتا سرد پ بھلا یہ خدمت، یہ دلسوزی، یہ انسانیت اور لگن کہیں معاوضہ سے خریدی جا سکتی ہے۔ کیا میں نے پیشہ ور نرسیں دیکھی نہیں۔ للی غیر معمولی طور پر اعلیٰ کیرکٹر کی عورت ہے اس کم عمری میں یہ لگن! یہ ہمت! یہ ہمدردی! کاش ـــــ کاش ہماری عورتوں میں بھی یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ نہ صرف اپنے عزیزوں کی بلکہ دوسروں کی بھی خدمت اور تیمارداری ایسی خوبی اور لگن سے کر سکتیں ـــــ مگر وہ ـــــ وہ تو گھر میں بھی

کوئی بیمار ہو تو شاید نہ پوچھیں ــــ سروپ بیزاری سے جواب دیتے تمھیں تو اپنے یہاں کی عورتیں سر سے پا تک عیب سے بھری نظر آتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نرس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ــــ جب تم ہندو عورت سے اس قدر بدگمان ہو تو میرا خیال یہ ہے کہ تمھیں کسی عیسائی لڑکی ہی سے شادی کرنا چاہیے ــــ پریم کو سروپ کی ان جلی کٹی باتوں سے دلی تکلیف ہوتی تھی وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ سروپ کیوں ناراض ہیں۔ مگر دل کو کیا کرتا جس پر للی کی تصویر نقش ہو گئی تھی للی کی اور اس کی آنکھیں چار ہوتیں تو اس کے سارے بدن میں بجلی کی سی لہر دوڑ جاتی۔ اس کی جھکی ہوئی دراز پلکیں اور متبسم چہرہ ــــ آنکھیں بند کرنے پر بھی اس کے سامنے رہتا جب للی اس کی نبض دیکھتی یا ٹمپریچر لیتی، غذا کھلاتی۔ یا بستر ٹھیک کرتی، کچھ پڑھ کر سناتی یا کبھی کبھار باتیں کرتی ــــ غرض جب تک بھی وہ اس کے پاس اور سامنے رہتی پریم کو اپنے اندر ایک غیر معمولی قوت اور طمانیت کا احساس ہوتا۔ اس کے دل اور دماغ کی گہرائیوں سے ہر وقت یہی آواز بلند ہوتی ــــ للی ــــ مخلص ــــ محنتی ــ تیماردار، خدمت گزار للی ــــ جاں نواز ــــ دلربا ــــ حسین ــــ محبوب ــــ دلکش ــــ للی ــــ اس کی نظریں للی کے چہرہ پر گڑ جاتیں جنھیں محسوس کر کے للی کا گندمی رنگ سرخی مائل ہو جاتا ــــ ہاتھوں میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہوتا اور وہ جلدی سے کسی کام کے لئے مڑ جاتی۔

پریم کی بیماری شروع ہوئے پانچ ہفتے ہو گئے۔ فروری شروع ہو چکا

ہے۔ راتوں کو جاگنے اور مسلسل محنت کی وجہ سے للی کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ
گئے ہیں اور چہرے سے تھکاوٹ اور کمزوری کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ سب سے
پہلے ماں جی نے اسے محسوس کیا اور بڑے پیار سے کہا "بیٹی تو نے پریمو کو تو موت
کے منہ سے نکال لیا —— اس کی ایسی خدمت کی کہ کیا کوئی کرے گا۔ پر ذرا
اپنی صورت تو شیشے میں دیکھ! گلاب کا سا چہرہ کیسا کملھا گیا ہے۔ اب تو ایشور
کی کرپا سے وہ اچھا ہے۔ اب اتنی محنت نہ کیا کر۔" للی نے مسکرا کر آہستہ سے کہا
"بہت اچھا ماں جی۔"

اس دن شام کو ماں جی دیر تک بیٹے کے پاس بیٹھی للی کے گن گاتی رہیں۔
"بٹیا وہ کوئی سدا سے عیسائی تھوڑا ہی ہے —— ماں باپ پر نہ جانے
کیا آفت آئی کہ دھرم سے بے دھرم ہو گئے اور عیسائی بن گئے۔ لڑکی میں تو
سارے گن ڈھنگ ہندو لڑکیوں کے سے ہیں۔ نہیں تو نگوڑی کرسٹی میں بھلا یہ
گن کہاں سے آتے۔"

پریم اب اچھا تھا۔ صرف کچھ کمزوری اور تھوڑی کھانسی باقی تھی۔ سوا
مہینے کی چھٹی کے بعد آج شام شانتی سروپ کو واپس جانا تھا۔ صبح کو انھوں نے
پریم سے کہا "بھئی میں اب جا رہا ہوں۔ چھٹی ختم ہو گئی۔ تم ہفتہ بھر اور آرام کر لو ذرا
طاقت آ جائے تو میں آ کر دہلی لے جاؤں گا۔" پریم کی آنکھوں میں احسان مندی
اور محبت کے آنسو بھر آئے۔ اس نے سروپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے
لگا لیا اور کانپتی آواز سے کہا "بھائی تمھاری محبت، عنایت اور خدمت کا شکریہ
میں زندگی بھر ——" سروپ نے ڈانٹا "اچھا اب یہ بکواس بند کر۔ مجھے

فضول باتیں پسند نہیں۔ ابھی پریم مس للی کے فادر کا خط آیا ہے کہ انھیں واپس آنا چاہیئے۔ تمھاری صحت بھی اب اچھی ہے۔ نرس کی کوئی ضرورت بھی نہیں وہ آج شام میرے ساتھ جائیں گی۔" پریم یہ سن کر سکتے میں آ گیا۔ وہ اب تک اپنے دل میں للی کے جانے کے خیال کو آنے ہی نہیں دیتا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بہ مشکل اس نے کہا "سروپ تم بھی چلے گئے اور مس للی بھی تو مجھے بہت تکلیف ہو جائے گی۔ ابھی میں بہت کمزور ہوں۔ کیا اور کچھ دن وہ نہیں ٹھہر سکتیں۔" شانتی سروپ نے جواب دیا" ان کے والد نے اصرار سے بلایا ہے اور پھر تم دیکھتے نہیں دن رات کی محنت کا اثر خود ان کی صحت پر خراب پڑ رہا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ وہ خود نہ بیمار ہو جائیں۔ عجب قسم کی نرس ہے۔ بھلا نرسیں ہر مریض پر یوں جان کھپائیں تو کاہے کو زندہ رہیں ۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ انھیں تم سے خصوصیت کے ساتھ کچھ ۔۔۔۔" پریم نے بات کاٹی "سروپ خدا کے لئے یہ نہ کہو ۔۔۔۔ ان کو فطرت کی طرف سے بے مثل ہمدردی کا مادہ ۔۔۔۔ اور تیمارداری کی بے نظیر صلاحیت عطا ہوئی ہے ۔۔۔۔ اس میں میری کوئی تخصیص نہیں۔" کچھ دیر بعد پھر کہا "ہاں ان کی فیس کیا ہے؟"

"تمھیں اس سے کیا مطلب میں جانوں اور وہ جانیں۔"

"یوں تو بھائی سب کچھ آپ ہی نے خرچ کیا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس، دواؤں کی قیمت، آمد و رفت کا خرچ ۔۔۔۔ وہ سب تو خیر بعد میں ادا کر دوں گا۔ مگر کم از کم مس للی کی فیس مجھے بتا دو کہ وہ میں ادا کر دوں۔"

تم ابھی سے اس قسم کی فکریں نہ کرو۔ اچھے ہو جاؤ۔ سب ادا کر دینا میں

تم سے سب رقم مع سود کے وصول کرلوں گا۔ بنیا جو ٹھہرا"۔

"بنک میں میرے پانسو روپے جمع ہیں۔ اس کا چک کاٹے دیتا ہوں وہ مس للی کو پیش کر دینا"۔

"ان کی فیس تو میں ان کے والد کو ادا کر چکا"۔

"آخر ان کی روزانہ فیس کیا ہے؟"

"پانچ روپے روز" ——— "پانچ روپے روز؟ اس قدر کم؟"

"اب میں ان سے یہ کیوں کہتا کہ آپ نے اس قدر کم فیس کیوں رکھی ہے میرا تو فائدہ ہی تھا۔ اگر تم کہو تو میں ہفتے بھر کی چھٹی لے کر واپس آجاؤں"۔

"نہیں نہیں۔ آپ کا پہلے ہی کافی وقت ضائع ہو چکا ہے۔ میں اب اچھا ہوں۔ تیمارداری کی کوئی خاص ضرورت نہیں"۔ یہ کہہ کر پریم نے آنکھیں بند کرلیں اور کسی خیال میں گم ہو گیا۔

شام کا وقت ہے۔ غروب آفتاب کی سنہری کرنیں زمین پر سونا بکھیر رہی ہیں۔ چڑیاں بسیرا لینے کے لئے پودوں اور درختوں کے آس پاس چوں چوں کرتی اڑ رہی ہیں۔ مویشی سارے دن چرنے چگنے کے بعد چراگاہوں سے واپس لوٹ رہے ہیں اور ریاض کے مکان کے سامنے شانتی سروپ کی جو چھوٹی سی کار کھڑی ہے اسے حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں شاید سوچتے ہوں کہ یہ کون سا جانور ہے

مس للی پریم کے کمرے میں رخصت کے لئے گئی ہوئی ہیں۔ سروپ دوسرے

رے میں اپنی کتابیں وغیرہ سمیٹ رہے ہیں۔ اور ماں جی بھاری کام کی ریشمی ساڑھی رومال میں احتیاط سے لپیٹ کر رکھ رہی ہیں کہ یہ ساڑھی اور اپنی بھدی سونے کی انگوٹھی اپنی منہ بولی بیٹی کو دوں گی۔

للی نے اپنی جھکی ہوئی پلکیں آہستہ سے اوپر اٹھائیں "اچھا مسٹر پریم اب اجازت دیجئے کہ رخصت ہوں" پریم جو آرام کرسی پر بے جان سے پڑا تھا یہ سن کر جوش میں تھوڑا سا اٹھ بیٹھا اور جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا "اچھا للی خدا حافظ۔ ممکن ہے اب ہم نہ مل سکیں مگر آپ کی بے مثل صفات آپ کی خدمت اور دلسوزی، شرافت اور لیاقت، محبت و ہمدردی کی یاد زندگی بھر میرے دل میں باقی رہے گی۔ آپ مجھے بھول جائیں گی مگر میں ہمیشہ اپنی محسنہ ——— رہنما ——— روشن دکھانے والی ہستی کو یاد رکھوں گا ——— آپ کو نہیں معلوم کہ آپ نے میرے جسم ہی کو نہیں ——— روح کو بھی ——— حیات تازہ بخشی ہے ——— کاش میں اس قابل ہوتا کہ ———" پریم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اشتیاق بھری نظریں للی کے چہرے پر گاڑ دیں للی کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں اور زیادہ جھک گئیں۔ اس نے رک رک کر اتنا کہا "مسٹر ——— پریم میں بھی آپ کو ——— کبھی نہیں بھولوں گی" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے مڑی تھی کہ پریم نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا للی نے تھوڑے سے تامل کے بعد اپنا نرم، سڈول اور سرد ہاتھ، پریم کے دبلے سخت اور گرم تپتے ہوئے ہاتھ میں دے دیا۔ پریم کچھ دیر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے رہا اور پھر یکلخت اپنی پرنم آنکھوں سے لگا کر

چھوڑ دیا اور آرام کرسی پر گر کر آنکھیں بند کر لیں۔ للی کچھ دیر کھڑی پریم کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ جیسے نرگس کے پھول پر شبنم کے قطرے! اور وہ جلدی سے کمرے کے باہر نکل آئی۔

ماں جی نے بہت سی دعاؤں کے بعد للی کو گلے سے لگا لیا (جس پر شانتی سروپ کو سخت تعجب ہوا کہ ان جیسی کٹر مذہبی عورت اور ایک "کرنٹی" کو گلے سے لگائے!) اور ساڑھی و انگوٹھی اسے دے کر کہا "بیٹی میں اس قابل کہاں کہ تیرے احسانوں کا بدلہ کر سکوں۔ مگر میں نے تجھے اپنی بیٹی کہا ہے اور یہ نشانی دیتی ہوں۔ انکار نہ کیجو۔ میری ایشور سے یہی پراتھنا ہے کہ اگلے جنم میں تو میری بیٹی ہو اور میں تیری ماں"۔

للی نے نہایت احترام سے اس عطیئے کو قبول کیا اور فرط عقیدت اور محبت سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماں جی بھی رونے لگیں۔ اس نے جھک کر ماں جی کے چرن چھوئے۔ ایک نظر پریم کے کمرے کی طرف ڈالی —— اور جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ شانتی سروپ بھی پریم اور ماں جی سے مل کر آ گئے۔ اور ایک کتاب للی کی طرف بڑھا کر بولے "لو یہ پریم نے تمھیں دی ہے"۔ اور کار چلا دی۔

دو ہفتے بعد پریم ماں جی کو وطن بھیج کر دہلی آیا تو اس نے آتے ہی سروپ سے للی کا پتہ پوچھا۔ انھوں نے کہا للی تو اپنے والد کے ساتھ کلکتے چلی گئیں۔ یہ سن کر پریم کو دھکا سا لگا۔ پتہ پوچھا تو سروپ نے لکھائی سے

کہا "مجھے نہیں معلوم میں نے ان کا پتہ دریافت نہیں کیا تھا"۔ پریم کو ان
کے اس جواب سے بہت کوفت ہوئی۔ سروپ نے اس کی ناگواری کو بھانپ
لیا "مجھے خود مس للی کے پتہ کی ضرورت تھی۔ سرلا بیمار ہے اور ان سے بہتر
تیماردار ملنا مشکل مگر افسوس کہ ان کا پتہ معلوم نہیں نہ یہ علم ہے کہ کب تک
آئیں گی"۔ پریم نے بے تعلقی کے انداز سے پوچھا "سرلا کیا بیمار ہیں" اور
یہ سن کر کہ اسے دس بارہ دن سے بخار ہے۔ پریم پر کوئی خاص اثر نہ ہوا
اس نے سوچا" آنے دو سب مجھے کیا۔ مانا اس کے چچا اور باپ بھائی نے
میری بیماری میں خدمت اور تیمارداری کی۔ مگر جس سے امید تھی ——
جو میری دکھ سکھ کی ساتھی بننے والی ہے۔ اس نے آنا تو درکنار اتنا بھی
نہ کیا کہ جھوٹ موٹ مزاج پرسی ہی کر لیتی —— یہ نہ سہی ایک خط ہی
ڈال کر خیریت پوچھ لی ہوتی —— اتنی لاپروائی! لاپروائی نہ سہی قدامت
پرستی سہی —— اور ایک غیر مذہب، غیر قوم کی اجنبی لڑکی نے کس محبت کس
دلسوزی ——" پریم پھر للی کے خیال میں کھو گیا۔

جب تک وہ دہلی رہا نہایت اداس اور پریشان۔ جب آگرہ جانے
لگا تو سروپ نے مشورہ دیا کہ تم کمزور ہو گئے ہو۔ ضرورت ہے کہ کوئی تمہاری
دیکھ بھال کرتا رہے۔ میرے خیال میں تم جلد شادی کر لو۔ غالباً اس وقت
بھائی صاحب بھی انکار نہ کریں گے۔ وہی پریم جو چند مہینے پہلے اس شادی
کے لئے بیقرار تھا بے پروائی سے بولا "نہیں بھائی ان کا معاہدہ سال بھر
بعد کا ہے۔ ابھی تو چھ سات مہینے ہوئے ہیں۔ ویسے میری مالی حالت بھی

خراب ہے۔ صحت بھی ابھی پوری طرح درست نہیں۔ اس میں حال میں شادی کرنا نامناسب ہے۔ ایسی جلدی ہی کیا ہے اور دل میں کہا جی سرلا ہی تو میری دیکھ بھال کریں گی! سروپ پریم کا منھ دیکھ کر چپ ہو گئے۔ اس کے جانے کے بعد بڑبڑائے "یہ کہو نہ کہ دل تو للی کو دے چلے۔ سرلا بچاری سے کیسے بیاہ کرو۔"

بہ ہزار خرابی اپریل میں پریم شادی پر راضی ہوا۔ اس کے باپ اور ماں تو اس رنج اور غصے میں نہ آئے کہ ان کی منتخب کردہ حسین، دولت مند اور برہمن لڑکی کو چھوڑ کر ایک ہیٹے خاندان میں لڑکا بیاہ کر رہا ہے جن کی مالی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہیں اور زیادہ دان دہیز ملنے کی بھی امید نہیں۔ لیکن دونوں بھائی اپنی بیویوں کو لے کر شرکت کے لئے آگرہ چلے آئے۔ پریم کی بیماری نے عزیزوں کے دل نرم کر دئے تھے۔ جی تو ماں جی کا بھی آنے کو چاہتا تھا اور اگر پریم جا کر منت خوشامد کرتا تو شاید وہ چلی آتیں مگر وہ بھی ان کا بیٹا تھا۔ اکڑ میں رہا اور نہ گیا۔

آگرہ سے پریم، دونوں بھائیوں بھاوجوں اور چند دوستوں کے ساتھ دہلی پہنچا۔ سادگی سے شادی کی رسوم ادا ہوئیں۔ رات کو ستیش چندر نے بڑے پیمانے پر لوگوں کی دعوت کی اور اگلے دن صبح کی گاڑی سے پریم دلھن کو رخصت کرا کے آگرہ لے آیا وہ شادی کے دوران میں اس قدر افسردہ، اداس اور کھویا کھویا رہا کہ سب دوست اور عزیز حیران تھے کہ اسے کیا ہوا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب اس کی بھاوجوں کو تھا کہ

اپنی پسند کی شادی اور اس قدر افسردگی !!

آج پریم کا کمرہ دلہن کی طرح آراستہ اور چنبیلی موتیا اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا ہے۔ باغیچہ کی طرف کی کھڑکیوں سے رات کی رانی کی روح افزا خوشبو کمرے میں آرہی ہے۔ بجلی کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ ایک کونے میں بجلی کا لیمپ سبز شیڈ سے ڈھکا ہوا روشن ہے جس سے تمام کمرے میں ہلکی ہلکی سبز رنگ کی دلفریب روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

پریم سادا لباس پہنے ہاتھ میں موتیا کا ایک گجرا لپیٹے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ اداسی کے بجائے اس کے چہرے پر اس وقت اشتیاق کا ہلکا سا رنگ جھلک رہا ہے۔ اس نے آتے ہی کمرے میں چاروں طرف نظر پھرائی مسہریاں خالی تھیں۔ کھڑکی کے سامنے ایک کوچ پر کوئی بیٹھا تھا۔ سرخ رنگ کی زرکار ساڑھی میں آنچل ماتھے سے نیچے تک جھکا ہوا گود میں کوئی کتاب رکھے، نیم غنودگی کے عالم میں کوچ کے تکیے سے سر لگائے سرلا نیم دراز تھی۔ پریم آگے بڑھا اس کی ایک تپائی سے ٹھوکر لگی تو سرلا چونک پڑی۔ گھونگھٹ اور نیچے سرک آیا اور وہ آہستہ سے تعظیم کے لئے کھڑی ہو گئی۔ مگر اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرہ گھونگھٹ میں پوشیدہ کھڑے ہوتے وقت، کتاب جو اس کی گود میں رکھی تھی۔ نیچے گر پڑی۔ پریم دلچسپی سے سرلا کو دیکھ رہا تھا وہ جھکا اور بے ارادہ کتاب فرش پر سے اٹھالی مگر اس کی جلد دیکھ کر وہ چونکا دھندلی روشنی کے سبب نام نہ پڑھ

سکا تو ہاتھ بڑھا کر بٹن دبا دیا۔ سارا کمرہ تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سرلا کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ پریم نے کتاب کا نام پڑھ کر کانپتے ہوئے سے اس کا پہلا صفحہ کھولا "جان نواز للی کو اس کے پریمی کی طرف سے!"
کتاب پریم کے ہاتھ سے چھوٹ کر سرلا کے قدموں پاس گر پڑی جس نے جھلک کر اسے اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ ڈرتے ڈرتے پریم کے منہ سے نکلا "یہ کتاب آپ کے پاس کیسے آئی؟" شیریں لیکن دھیمی آواز سے جواب دیا گیا "یہ میرے سب سے عزیز دوست کا تحفہ ہے۔" آواز سُن کر پریم چونک پڑا۔ دو قدم سرلا کی طرف بڑھا تو وہ شرما اور گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گئی اور گردن اور زیادہ جھکا لی۔ پریم نے سرلا کا گھونگھٹ سرکایا اور نرمی لیکن زبردستی سے سرلا کا چہرہ روشنی کی طرف پھیرا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں سرخ رخساروں کو چھو رہی تھیں اور لبوں پر ایک دلاویز تبسم کھیل رہا تھا ــــ "للی؟ ــــ میری للی!" تعجب، خوشی، حیرت کے گوناگوں جذبات کی وجہ سے پریم کے منہ سے اور کچھ نہ نکل سکا۔ سرلا کی موٹی موٹی آنکھیں ایک لمحے کے لئے پریم کی مشتاق آنکھوں سے ملیں اور جھک گئیں "نہیں سرلا ــــ آپ کی داسی ــــ"

اگلے دن سویرے ہی پریم ماں جی کو لینے روانہ ہو گیا اور منت خوشامد کر کے انھیں لے ہی آیا۔ سرلا نے ماں جی کی دی ہوئی ساڑھی باندھی، ان کی انگوٹھی انگلی میں پہنی اور جیسے ہی ماں جی تیوری پر بل ڈالے

دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔ اس نے ان کے چرن چھو لیے۔ ماں جی اپنی ساڑھی اور انگوٹھی دیکھ کر بہت حیران ہوئیں انھوں نے جلدی سے گھونگھٹ ہٹا کر بہو کا منہ دیکھا اور خوشی سے باغ باغ ہو کر اپنا چندن ہار سرلا کے گلے میں ڈال دیا۔ اور اسے گلے سے لپٹا لیا۔

سرلا اور پریم ماں جی کے قدموں کی طرف جھکے لیکن انھوں نے اٹھا کر دونوں کو چھاتی سے لگا لیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں محبت کے آنسوؤں سے چمک رہی تھیں۔

محبت کے کھیل

سری نگر
کشمیر
۱۰ جون ۴۲ء

فرحت پیاری۔ خفا نہ ہو بہن آج سب دن کی کسر نکال دوں گی۔
یہ سچ ہے کہ میں جب سے یہاں آئی تمھیں کوئی خط نہیں لکھا مگر خیال کرو
چار دن کا سفر اور سفر بھی کیسا؟ دو رات اور ایک دن تو مسلسل ریل کے
جھٹکوں میں گزرے، مسافروں کی چیخ پکار، لڑائی جھگڑے۔ بچوں کا رونے
دھونے اور بے اندازہ کھانے اور جگہ بے جگہ ——— غرض ناک میں دم
تھا گاڑیوں کی کمی اور پٹرول راشنگ کی وجہ سے ریلوں میں اس قدر ہجوم ہونے
لگا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ایک مرتبہ میں امی جان کی گود میں سر رکھ کر اور پاؤں
سکیڑ کر ذرا اونگھنے لگی تو ایک تین من کی عورت میری ٹانگوں پر چڑھ بیٹھی اور
نہایت غصّے سے بولی "سو کڑی سونہ تیری لتاں (ٹانگیں) توڑوں تو سہی"
خدا خدا کر کے ریل کا سفر ختم ہوا تو راولپنڈی پر بس والوں کی یورش ہر ایک

کا اصرار کہ اس کی گاڑی سب سے بہتر اور سب سے کم کرایہ کی ہے۔ حالانکہ کرایہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ماموں ابا بچارے انجان اور سیدھے سادے آدمی سب نے مل کر انھیں بوکھلا دیا وہ تو کہو صفیہ آپا ہمیشہ کشمیر آتے جاتے رہنے کی وجہ سے بہت کچھ جانتی ہیں انھوں نے سب کو ڈانٹ کر بھگایا اور ایک بس والے سے معاملہ طے کر کے ہم لوگ اس پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیور کی پاس والی سیٹ پر ماموں ابا بیٹھے اور اس سے پچھلی سیٹ پر امی جان صفیہ آپا، ان کی بچی نادرہ اور میں۔ بس والے نے کہا تھا کہ گاڑی نو دس بجے روانہ ہو جائے گی مگر بارہ بج گئے اور گاڑی آج چلتی ہے نہ کل۔ گرمی کے مارے سب کا برا حال۔ پنکھا جھلتے جھلتے ہاتھ ٹوٹنے لگے۔ ماموں ابا بچارے ٹوپی اتارے، اچکن کے بٹن کھولے ایک ہاتھ میں پنکھا دوسرے میں لیمن کا گلاس لئے غرض عجب بوکھلائی صورت بنائے ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر پھر رہے تھے اور ہر ایک سے پوچھتے "ارے بھئی آخر یہ بس کب روانہ ہوگی" ایک بوڑھے سے آدمی اور ایک نوجوان شخص بھی اسی بس میں جانے والے تھے۔ وہ بھی ادھر ادھر پریشان پھر رہے تھے۔ آخر ساڑھے بارہ پر بس کے چلنے کے آثار نظر آئے۔ وہ دونوں مسافر بھی آکر ہماری سیٹ کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جب گاڑی چلنے والی تھی تو ایک لکھنوی وضع کے صاحب اور آکر سوار ہو گئے۔ باقی ساری گاڑی میں کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک بجے کے قریب گاڑی روانہ ہوئی اور پسینہ میں ہوا جو لگی تو ذرا دم میں دم آیا دو گھنٹے کے بعد مری کی

چڑھائی شروع ہوئی تو ہوا میں خوشگوار خنکی سی آگئی جس سے مجھے بڑی فرحت ہوئی۔ (تم کیوں کھل گئیں ؟) مگر اماں جان کو تو چکر پہ چکر آرہے تھے۔ منہ لپٹے کھڑکی میں سر رکھے بیٹھی رہیں۔ نادرہ کو بھی رستے بھر قے ہوتی رہی اور صفیہ آپا اسے سنبھالنے میں مشغول رہیں۔ رہے ماموں ابا تو ان کی نہ پوچھو۔ بری گت تھی۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد ان کا سر کھڑکی سے باہر ہوتا تھا اور ابکائیوں کی آواز دوسروں کا بھی جی خراب کر دیتی اور پھر ان کی للکار "تلو بیٹی ذرا پان کا ٹکڑا تو دیجو۔" اور میں جلدی سے پاندان سے تازہ پان بنا کر ان کی خدمت میں پیش کر دیتی۔ پیچھے والا بڈھا تو خدا جانے کتنی راتوں کا جاگا ہوا تھا کہ مزے سے نیند بھر رہا تھا۔ باقی رہے دو آدمی ان میں سے ایک جو وضع قطع سے علی گڑھ کالج کا پڑھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چپ چاپ بیٹھا سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا اور دوسرا جو اس کے پاس بیٹھا تھا پان پر پان چبا رہا تھا۔ بس کی فضا اس قدر گھٹی اور بے کیف تھی کہ میری طبیعت الجھنے لگی میں نے اپنے اٹیچی کیس سے بال جبریل نکالی اور ساقی نامہ پڑھنے لگی۔ میں پڑھنے میں محو تھی کہ ماموں ابا کی آواز "تلو بیٹی پان تو دیجو" نے چونکایا اور میں بادل ناخواستہ کتاب چھوڑ کر پان بنانے لگی کہ پیچھے سے نہایت باریک اور زنانہ سی آواز آئی "لیجئے حضرت لیجئے پان سے شوق فرمائیے"۔ دوسرے نے جواب دیا "شکریہ ۔ میں پان کا عادی نہیں ہوں"۔ جواب ملا "حضرت کمال کرتے ہیں۔ پان بھی ایسی چیز ہے جس سے انکار کیا جائے ۔ آپ کو میری قسم ایک گلوری کھا کر تو دیکھئے پھر انکار کریں تو جانیں"۔ دوسرے

نے کچھ ہنس کر کہا "مہربانی۔ آپ تو بہت متواضع واقع ہوئے ہیں۔ لائیے آپ کا اصرار ہے تو کھائے لیتا ہوں"۔ میں ماموں ابا کو پان دینے کے بعد ان لوگوں کی باتیں سننے میں محو ہو گئی۔ لکھنوی حضرت نے فرمایا "قبلہ خمیرا لیجئے گا۔ بہت خوشبودار ہے"۔ علی گڑھی بولے "معاف کیجئے میں تو تمباکو کبھی چھو بھی نہیں سکتا"۔ انھوں نے تعجب سے کہا "یعنی خمیرا بھی نہیں؟ حضرت لکھنو کا خوشبودار بے مثل خمیرا ہے خاص اصغر علی محمد علی کی دکان کا آپ کھا کر تو دیکھئے واللہ صل علی نہ کہہ اٹھیں تو سہی"۔ "نہیں جناب مہربانی! میں تو اگر رتی بھر کھا لوں گا تو دو دن حالت خراب رہے گی"۔ اسی قسم کی باتیں ان لوگوں میں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کچھ بحث چھڑ گئی۔ غور سے سنا تو وہی پرانا موضوع یعنی لکھنو اسکول اور دہلی اسکول کی شاعری پر گرماگرم بحث ہو رہی تھی بڑی دیر تک وہ دونوں بحثتے رہے۔ لکھنوی حضرت اپنی پسند کی شاعری میں رطب اللسان تھے۔ یعنے وہی کنگھی چوٹی، ضلع جگت، انشاؔ اور ناسخؔ کی قسم کی شاعری کے دلدادہ۔ مگر دوسرے کا مذاق بہت ستھرا معلوم ہوتا تھا جب لکھنوی حضرت کوئی رنگیلا شعر انشاؔ، جرأتؔ وغیرہ کا سناتے تو وہ غالبؔ، میرؔ، دردؔ وغیرہ کے نہایت پاکیزہ اور عمدہ شعر جواب میں پڑھ کر کہتا "جناب انصاف تو فرمائیے کہاں یہ شعر اور کہاں وہ آپ کا شعر کوئی نسبت بھی ہو"۔ مجھے اس کی باتیں سن کر بہت دلچسپی ہوئی کہ اس شخص کا بڑا اچھا ذوق ادب ہے۔ میں نے نقاب منہ پر ڈال کر تھوکنے کے بہانے ذرا جھک کر پیچھے دیکھا۔ وہ سانولے رنگ کا شخص تھا اچھے نقش و نگار، سر پر بڑے

بڑے بال جو الٹے ہوئے تھے، ترکی ٹوپی گود میں رکھی ہوئی تھی، سیاہ شیروانی اور لٹھے کا سفید آڑا پاجامہ، صورت سے شرافت اور ذہانت برستی تھی کچھ دیر بعد لکھنوی حضرت نے کہا "معاف فرمائیے ہم نے اب تک حضور کا اسم گرامی تو دریافت ہی نہیں کیا" اس نے جواب دیا "مجھے پرویز کہتے ہیں اور جناب کا اسم شریف" "حضرت اس حقیر پُر تقصیر کو لوگ جمالی کہہ کر پکارتے ہیں" "اوہو تو آپ لکھنؤ کے مشہور شاعر جمالی ہیں۔ بڑی خوش قسمتی کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی" کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں صفیہ آپا نے مجھ سے کہا "نیلوفر سنا یہ وہی خبطی شاعر ہے جس کا کلام تم بہت ناپسند کرتی ہو" میں نے کہا "ہاں" پھر میں اور صفیہ آپا بھی آپس میں کچھ ادب اور شاعری کے متعلق آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ پرویز صاحب اب خاموش بیٹھے تھے اور لکھنوی شاعر جمالی اونگ رہے تھے۔ مجھے یکایک یہ خیال ہوا کہ شاید پرویز صاحب ہماری باتیں نہ سن رہے ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ کھڑکی پر جھکے ہوئے غور سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے میں جھینپ کر چپ ہو گئی اور وقت کاٹنے کو بال جبریل پڑھنے لگی۔ رات کے سات بجے کے بعد ہماری بس دومیل پہنچی ڈاک بنگلہ میں ایک کمرے میں ہم لوگ اترے اور باہر برآمدے میں ماموں ابا کا پلنگ بچھوا یا گیا۔ برابر والے کمرے میں پرویز اور ان کے ساتھ کے بڈھے آدمی۔ خدا جانے جمالی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ رات کو تھکان کے باعث بڑے مزے کی نیند آئی۔ صبح سویرے ناشتہ سے فارغ ہو کر پھر روانہ ہو گئے۔ بازار

کی ایک دوکان کے اوپر کے کمرے سے جمالی صاحب کو لیا۔ ان سے اور
پرویز صاحب سے صاحب سلامت اور رسمی مزاج پرسی ہوئی۔ اب جو بس
پر سوار ہونے لگے تو سچ کہتی ہوں فرحت لطف ہی آ گیا۔ جمالی صاحب
اڑ گئے کہ "حضرت پہلے آپ سوار ہوں اور پرویز کہتے ہیں کہ نہیں جناب
آپ سوار ہو جائیے"۔ اب پہلے آپ، نہیں پہلے آپ کا دلچسپ اور
پرانا مذاق شروع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ پرویز صاحب اس لئے پہلے
نہیں بیٹھتے تھے کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھنا چاہتے تھے۔ بہرحال انھوں
نے زبردستی پہلے جمالی ہی کو بٹھایا اور خود میرے پیچھے والی سیٹ پر
بیٹھے۔ اب پھر ماموں ابا کی متلی، امی کے چکروں، نادرہ کی قے اور جمالی
کی اونگھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں کچھ دیر تو چپ بیٹھی رہی پھر صفیہ آپا
سے باتیں ہونے لگیں۔ اب کشمیر کی سرحد شروع ہو چکی تھی اور مناظر بہت
خوشنما تھے۔ میں کھڑکی میں جھکی جہلم اور سامنے کے دلکش سین کو دیکھ رہی تھی اور
شاید پیچھے سے پرویز بھی سین دیکھنے میں محو تھے۔ بے اختیار میری زبان
سے نکلا "اچھی صفیہ آپا دیکھنا کیا پیارا منظر ہے"۔ پیچھے سے ہلکے سے کسی
نے جواب دیا "واقعی کیا کہنے ہیں"۔ میں جھجک کر چپ ہو گئی۔ اب جو
سامنے نظر اٹھی تو ڈرائیور کے داہنے ہاتھ کی طرف باہر جو شیشہ لگا
ہوتا ہے۔ اس میں پرویز کی شکل نظر آئی اور پیچھے ہٹنے بھی نہ پائی تھی کہ
کھڑکی سے جھکے ہوئے پرویز سے آئینہ میں میری آنکھیں چار ہوئیں اور
میں نے جھجک کر جلدی سے نقاب ڈال لی۔ اب مجھے خیال آیا کہ کہیں کل

اور آج اس شیشہ کی وجہ سے میرا ان سے سامنا تو نہیں ہوتا رہا؟ ڈر کے مارے پھر میں نے منہ نہیں کھولا۔ صفیہ آپا نے کہا بھی "ارے سامنے کون ہے منہ کھول لو نا"۔ مگر میں چپ رہی۔ جمالی صاحب جب خوب نسیند بھر چکے تو پھر انھوں نے پان پیش کیا اور دوبارہ بحث شروع ہوئی۔ یہ حالی پر تھی، تم جانتی ہو مجھے حالی اور ان کی شاعری کس قدر پسند ہے یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ پرویز صاحب حالی کے بے حد مداح تھے۔ جمالی حالی پر اور ان کی شاعری پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور پرویز دنداں شکن جواب دیتے تھے۔ جمالی انھیں سرے سے شاعر ہی ماننے پر تیار نہیں تھے مگر پرویز سند میں ان کے چوٹی کے شعر پڑھ پڑھ کر لاجواب کر دیتا تھا۔ موضوع بحث حالی سے اتر کر اقبال پر آگیا۔ اب تو میں اور بھی سنبھل کر بیٹھ گئی جی چاہتا تھا خود بھی اس بحث میں حصہ لوں مگر سوا غور سے سننے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اقبال کو جمالی شاعر تو مانتے تھے مگر نہ ایسا جیسے لکھنوی شعرا۔ اس پر پرویز کو غصہ آگیا۔ وہ غصے میں کچھ کا کچھ کہہ جاتا مگر جمالی صاحب کی گفتگو تہذیب و ادب آداب کے دائرے سے اس وقت بھی باہر نہیں نکلی۔ پرویز نے کہا "آپ نے اقبال کی کوئی کتاب دیکھی بھی ہے؟ بال جبریل یا ضرب کلیم کسی کو پڑھا ہے؟ شاید جمالی نے انکار کیا کیونکہ میں نے اس کا جواب نہیں سنا۔ اس کے بعد پرویز نے ذرا جھک کر کہا "مہربانی کر کے اپنی بال جبریل ذرا دیجئے گا"۔ میں نے صفیہ آپا کی طرف دیکھا انھوں نے کہا "دیدو کیا ہرج ہے"۔ میں نے کتاب سیٹ کے تکیہ پر رکھ دی اور

پرویز نے شکریہ کہہ کر اٹھالی اور پھر ساقی نامہ کو نہایت خوش آوازی سے پڑھ کر جاوی کو سنانے لگے۔ میں بھی شوق سے سنتی رہی۔ غرض اس قسم کی باتوں میں سری نگر کے قریب پہنچ گئے۔ پرویز نے کھڑکی سے سے جھک کر کتاب بڑھائی اور کہا "بہت بہت شکریہ لیجئے اپنی کتاب" میں منہ کھولے بیٹھی تھی بے خیالی میں مڑ کر دیکھا تو پرویز سے پھر آنکھیں چار ہوئیں.......... گھبرا کر ہٹی تو پرویز کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ پرویز نے موٹر ٹھیرا کر دور پیچھے جا کر کتاب اٹھائی اور بہت معذرت کے بعد واپس کی۔ امی جان نے پوچھا یہ کیسی کتاب اس مردوئے نے دی ہے۔ صفیہ آپا نے کہہ دیا کچھ نہیں اقبال کی ایک کتاب تھی ان صاحب نے پڑھنے کو مانگی تھی۔ ہم نے دے دی تھی۔

ایک بجے ہم سری نگر پہنچے۔ دولھا بھائی بس پر موجود تھے۔ ہم لوگ ان کی موٹر میں بیٹھ کر گھر آگئے۔ میری نظر پڑی تو پرویز ہماری موٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہاں دولھا بھائی کی ماں بہنیں بھاوج سارا کنبہ جمع ہے۔ ہمیں انھوں نے اپنے مکان کے سامنے گگری بل پر ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھیرایا ہے۔ ماموں ابا پانی سے ڈرتے ہیں اس لئے صفیہ آپا کے گھر ہیں۔ میں اور امی جان ہاؤس بوٹ میں ہیں۔ دولھا بھائی کے چچا زاد بھائی نفیس بھی یہیں آتے ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس کشتی میں آگئے ہیں۔ اور ہاں بلقیس (دولھا بھائی کی چھوٹی بہن۔ وہی جو میرے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی) کو بھی میں کشتی میں ہی لے آئی ہوں۔ آج کل

وقت بڑے مزے سے گزر رہا ہے۔ سارے دن ہنسی مذاق، سیر تماشے
پکنک، باغوں کی سیر غرض خوب دلچسپی رہتی ہے۔ یہاں کی بہت سی
معزز عورتوں سے ملنا جلنا بھی ہو گیا ہے۔ تم بہت یاد آتی ہو......
کاش تم بھی ساتھ آسکتیں..............
ایک مزے کی بات اور سناؤں دیکھو کسی سے کہنا نہیں۔ کان لاؤ
اور قریب۔ اسے بھی راز کی بات ہے اور پاس لاؤ کان۔ کوئی
سن نہ لے۔ آج کل بی بلقیس اور نفیس بھائی میں خوب.........
بس سمجھ جاؤ۔

ہمیشہ تمھاری نیلوفر

گگری بل ۔ سری نگر

۲۵ رجون سنہ۴۲ء

پیارے جاوید۔ پچھلے خط میں تمھیں اپنے سفر کا مفصل حال لکھ چکا ہوں جواب کا انتظار ہے۔ بندۂ خدا فوراً جواب دیا کرو۔ مگر تم کیا کرو شاعر آدمی ٹھیرے کاہلی نہ کرو تو وضع داری میں فرق آجائے۔

اتنا لکھ چکا تھا کہ تمھارا خط ملا۔ واہ واہ مزے میں آگئے۔ بھلا کہاں تمھارا لاابالی مزاج پرویز اور کہاں عشق و عاشقی۔ بس والی لڑکی کا ذکر تو محض تمھاری دلچسپی کو لکھ دیا تھا ورنہ مجھے اس سے کیا مطلب! یہ ضرور ہے کہ جمالی صاحب کی بدمذاق گفتگو کے مقابلے میں اس لڑکی کی باتیں (اپنی بہن سے) بہت زیادہ دلچسپ تھیں۔ کیونکہ اس کا ادبی مذاق بہت پاکیزہ اور سلجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بال جبریل میں اس نے اپنے پسندیدہ اشعار پر نشان لگا رکھے تھے یقین مانو جاوید ان میں سے اکثر شعر وہ تھے جن پر میں جان دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ ڈرائیور کے داہنے ہاتھ والے آئینہ

میں اس کی بھولی بھالی دلکش شکل اور موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اور گھنی جھکی ہوئی
پلکیں اکثر نظر پڑ جاتی تھیں اور میں انھیں دیکھا رہتا تھا۔ کیونکہ اس کی صورت
مجھے بھلی لگتی تھی۔ لیکن تمھیں یہ سن کر ضرور غصہ آئے گا (تم ٹھیرے رومانی
آدمی) کہ نہ تو میرا دل اچھل کر میرے منہ میں آیا، نہ پہلی ہی نظر میں ہماری
روحوں کا اتحاد ہوا اور نہ ہم دونوں ایک دوسرے پر بری طرح فریفتہ
ہو گئے۔ اس لڑکی کو تو (جس کو اس کے ماموں نلّو کہہ کر پکارتے تھے عجیب
بے ڈھنگا نام ہے!) جیسے ہی معلوم ہوا کہ شیشے میں میرا اس کا سامنا ہو
رہا ہے پھر اس نے نقاب ہی نہیں الٹی اور نہ میں دوبارہ اسے دیکھنے کو
بے قرار ہوا ہاں جب وہ ہنستی تھی تو اس کی ہنسی کی آواز مجھے بے شک
بہت دلکش معلوم ہوئی۔ غالباً اس لیے کہ بس کی اداس اور گھٹی فضا میں
وہی ایک چیز تھی جس سے زندگی اور زندہ دلی پائی جاتی تھی لیکن یہ
مجھے یقین ہے کہ اگر تم میری جگہ ہوتے تو اسی وقت اپنی فرحت کو بھول
کر اس پر عاشق ہو جاتے اور پھر سری نگر کے کسی شاداب مقام پر نکلے
تو وہیں ہاں پھول (آج کل لالہ کے پھولوں کی یہاں کے مرغزاروں میں
بہت کثرت ہے) ضرور چنتے ہوتے اور کسی نہ کسی طرح اس کا پتہ لگا کر
اسے پریشان کرتے مگر شکر ہے کہ نہ میں عاشق مزاج شاعر نہ خیال پرست
فسانہ نگار۔

آج کل پٹرول راشننگ کی وجہ سے چچا جان کی موٹر بے کار پڑی
رہتی ہے اور انھوں نے ایک چھوٹا سا خوبصورت تانگہ خرید لیا ہے مگر

وہ رہتا زیادہ تر میرے ہی استعمال میں ہے چشمہ شاہی، نشاط، شالامار اور ہاردن سیر کرنے تانگے پر جاتا ہوں اور سری نگر کی چوڑی چوڑی عمدہ سڑکوں پر عربی نسل کا گھوڑا خوب تیزی سے دوڑتا ہے اور بڑا لطف آتا ہے اکثر تو میں تانگے کے نوکر کو بھی ساتھ نہیں لیتا۔

وہ بے وفا نفیس آج کل یہاں مزے اڑا رہا ہے۔ کل آپ بڑی شان سے سوٹ ڈاٹے، ڈل پائنٹ پر دو سیاہ برقعہ پوش عورتوں کے ساتھ چہل قدمی فرما رہے تھے۔ میں نے وہیں کان پکڑ کر ساری صاحبی نکال دی۔ وہ کہتا ہی رہا ارے بھئی ٹھیر تو سہی میرے ساتھ خواتین ہیں انھیں پہنچا آؤں مگر میں کب ماننے والا تھا خواتین جیسے بچاری بڑی بھولی تھیں وہ اتنی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھیں۔ میں نے کہا سچ بتا یہ کون ہیں جن کے ساتھ یوں گل چھرے ...." اس نے مجھے ڈانٹا کہ بدتمیز چپ رہ وہ تو میری بہنیں ہیں۔ بھئی پھر میں کیا کہتا؟ اس نے بات ہی ایسی کہی کہ چپ ہو گیا۔ اچھا بھئی اب چلدئے ....

تمہارا پرویز

۵ر جولائی ۴۲ء

سری نگر۔ گگری بل

فرحت میری پیاری۔ تمہارا خط کیا آیا میری جان میں جان آ گئی۔
معلوم ہوا جیسے میں اپنی پیاری فرحت سے باتیں کر رہی ہوں۔ کاش تم یہاں
ہوتیں اور ہم مل کر سری نگر کے شاداب اور دلکش مناظر سے لطف اندوز
ہوتے۔ تم نے اپنے خط میں میرا مذاق اُڑایا ہے کہ میں نے پرویز کی تعریف
کیوں کی۔ خیر مذاق اُڑانے کو جتنا جی چاہے اُڑاؤ میں بُرا ماننے والی نہیں
لیکن کسی کی تعریف کرنا کوئی معیوب بات نہیں خصوصاً ادبی مذاق کی لیکن
تم یہ سن کر متعجب اور خوش ہوگی کہ اب میں نے اپنی رائے بدل دی جس
شخص کی شرافت اور ذوق ادب کی میں تعریف کرتی تھی اس سے اب
نفرت کرتی ہوں دلی نفرت..... کیوں؟ سُنو!
پچھلے اتوار کو ہم سب نے مل کر طے کیا کہ بہت سویرے سے نشاط

باغ چلیں گے۔ صفیہ آپا کی ساس اور امی جان، ماموں ابا وغیرہ نے کہا کہ
ہم لوگ دوپہر تک موٹر میں آجائیں گے اور بلقیس، نفیس بھائی، صفیہ آپا
ان کے دیور اور دیورانی، میں نادرہ اور نوکر چاکر سب صبح چھ بجے سے ڈونگے
میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے جسے تین چار ہانجی کھے رہے تھے اور ساتھ
ساتھ گاتے بھی جاتے تھے صبح کا سہانا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے نرم
نرم جھونکے، مشرق کی طرف شفق کی دلفریب سرخی، ڈل کے شفاف پانی
پر ڈونگے کا آہستہ خرامی سے چلنا، ہانجیوں کے گانے کی آواز! کیا بتاؤں
کیسا دلکش سین تھا۔ ہم سب بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے۔ نفیس بھائی
کو جب ترنگ آئی تو وہ بھی گانے لگے۔ پھر تو سب نے اپنی اپنی پسند کے
اشعار، کسی نے گا کر کسی نے ویسے ہی سنائے۔ آٹھ بجے ڈونگے پر ہی ناشتہ
تیار کر کے کھایا اور پھر گراموفون بجاتے رہے۔ ہم لوگ نشاط باغ سے کچھ ہی
دور تھے کہ ہمارے ڈونگے کے پاس سے ایک شکارا گزرا جس میں دو
بوڑھے آدمی چپکے لگاتے ہیں دراز تھے اور بیچ کی طرف ایک نوجوان
سیاہ شیروانی، سفید آڑا پاجامہ پہنے، ننگے سر، ٹانگ پر ٹانگ رکھے
بیٹھا ہوا تھا۔ تم جانو سیر کرتے کراتے کون ہر دم نقاب ڈالے رہتا ہے
ہم سب ہی مزے سے منہ کھولے بیٹھے تھے کہ شکارا بالکل پاس سے ہو کر
گزرا تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہمارا ایب والا ساتھی پرویز تھا جو بڑے
غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بلقیس کی آڑ میں ہو گئی ——
نفیس بھائی سے اور اس سے صاحب سلامت ہوئی اور شکارا تیزی سے

آگے بڑھ گیا۔ میں نے نفیس بھائی سے پوچھا یہ کون تھا جسے آپ نے سلام کیا۔ انھوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ میرا دوست ہے۔ پرویز میرا جی چاہا کہ کچھ اور بھی پوچھوں مگر کچھ سوچ کر چپ ہو گئی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب ہم لوگ نشاط باغ پہنچ گئے۔ گیارہ بجے تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اتوار کے دن ان باغوں میں اس کثرت سے لوگ سیر کرنے آتے ہیں کہ بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ ہم نے ذرا الگ ہٹ کر ایک چنار کے درخت کے نیچے دری بچھائی۔ سب سامان نکالا اور کھانا پکایا۔ پوریاں، آلو قیمہ وغیرہ۔ نوکروں کو چھٹی دے دی تھی۔ سب کام خود ہی کیا، ایک بجے تک سارا کھانا تیار ہو گیا اور سب نے مل کر خوب مزے لے لے کر کھایا ہنسی مذاق بھی ہوتا رہا۔ ذرا آنکھ بچی اور دوسرے کا نوالہ اُچک لیا۔ امی جان، صفیہ آپا کی ساس، ماموں ابا وغیرہ ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے اور ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کھانے کے بعد برتن دھونے کے لئے میں نادرہ کو ساتھ لے کر پانی لینے کے لئے گئی۔ نل سے پانی لے کر واپس آرہی تھی کہ میرے کان میں آواز آئی کوئی اللہ کا بندہ محتاج غریب کو پانی پلا دے۔ میں ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی کہ کون پانی مانگ رہا ہے ایک چنار کے درخت کے نیچے بس والا ساتھی پرویز پاؤں پھیلائے لیٹا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ یہ پانی مانگ رہا ہے یا کسی اور کی آواز تھی۔ اتنے میں اس نے اور زور سے کہا۔ اللہ کے نام پر پانی کے دو گھونٹ پیاسے کو پانی پلانا بڑا ثواب ہے میرا دل زور زور سے

بھڑکنے لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ شخص شرارت سے پانی مانگ رہا ہے میرا دل کانپ گیا کہ کوئی پانی مانگے اور اسے نہ پلایا جاوے؟ یاد ہے بچپن ہی سے ہم لوگوں کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ دیکھو خبردار کبھی کسی کو پانی پانی پلانے سے انکار نہ کرنا۔ گناہ ہوتا ہے۔ وہی بات اس وقت دماغ میں گونج رہی تھی۔ نادرہ سے کہا جا بی بی ان صاحب کو پانی پلا دے مگر وہ ایک ہی ضدن ہے۔ یہی کہے گئی کہ خالہ تم چلو گی تو میں بھی چلوں گی۔ میں دو تین منٹ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پرویز غور سے مجھے دیکھتا رہا (میرے چہرے پر نقاب پڑا ہوا تھا) آخر میں جانے کو مڑی تو کہنے لگا "ایسی بے دردی" میں بھاگتی ہوئی اپنے ساتھیوں میں آ ملی اور پھولے ہوئے سانس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "نفیس بھائی ایک آدمی ادھر پیاسا پڑا پانی مانگ رہا ہے اسے پانی پلاؤ۔" نفیس بھائی جگ لے کر گئے پانچ منٹ بعد ہنستے ہوئے آئے اور کہا وہ پیاسا ہی نہیں بھوکا بھی ہے اگر کچھ کھانا ہو تو دے دو بچارا دعا دے گا" میں نے منہ بنا کر جواب دیا "تو یہ ہے یہاں بھی ان کمبخت فقیروں سے پیچھا نہ چھٹا" اور ایک پلیٹ میں پوریاں آلو قیمہ، وغیرہ رکھ کر دے دیا۔ سچ مانیو فرحت وہ تو پانچ منٹ میں سب چٹ کر گیا!!

نفیس بھائی تو اپنے دوست کے ساتھ کہیں چلے گئے اور ہم پہلے تو گراموفون بجاتے رہے پھر راے ہوئی کہ شالامار میں جا کر چائے پی جائے لہذا وہاں پہنچے پہلے گھومے پھرے پھر چائے بنا کر پی۔ کئی ملتے دالیاں

مل گئیں۔ ان سے باتیں ہونے لگی۔ امی جان وغیرہ نے جانے کی جلدی کی تو
ہم نے کہا آپ لوگ موٹر لے جائیے۔ ہم ذرا ٹھیر کر آئیں گے
صفیہ آپا بھی نادرہ کو لے کر ان کے ساتھ ہی چلی گئیں۔ اب بلقیس اور صفیہ
آپا کی دیورانی اور دیور، بڑی نند اور ہم لوگ رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد
بلقیس کے چھوٹے بھائی نے آکر کہا۔ میرے ایک دوست کی بیوی تم لوگوں
سے ملنا چاہتی ہیں چلو۔ میں نے اور بلقیس نے جانے سے انکار کر دیا اور
وہ اپنی بڑی بہن اور بیوی کو لے کر چلتے ہوئے جاتے جاتے کہہ گئے
تم لوگ نفیس کے ساتھ ڈونگے پر آجانا۔ میں نے کہا نفیس بھائی یہاں کہاں
ہیں کہنے لگے۔ ابھی یہیں تھا مل جائے گا۔ کچھ دیر تک ہم کھڑے باتیں
کرتے۔ اور فوارے میں بجلی کی روشنی کی بہار دیکھتے رہے۔ اب جو دیکھتے
ہیں تو نفیس بھائی کا کہیں پتہ نہیں جی پریشان ہوا۔ میں نے اور بلقیس نے
ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جا کر اور پر تک دیکھ آئے مگر وہ نہ ملے اب ہماری
ملنے والیاں بھی جا چکی تھیں۔ صرف دو عیسائی عورتیں جن سے ہم سے خاصی
ملاقات تھی۔ ابھی تک کھڑی تھیں۔ میں نے کہا چلو بلقیس ڈونگے پر چلیں
وہاں ہی سب ہوں گے۔ مگر وہاں جا کر دیکھتے ہیں تو نہ ڈونگا نہ کوئی نوکر
نہ نفیس نہ بلقیس کے بھائی بھاوج۔ اب تو ہمارے آتے حواس غائب ہو گئے
یا اللہ کیا کریں۔ گھبراتے ہوئے پھر باغ میں واپس آئے۔ شام کی تاریکی
بڑھتی جا رہی تھی لوگ ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ اور ہم دونوں
حیران پریشان کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ ہماری

عیسائی دوستیں ابھی تک کھڑی تھیں۔ میں نے ان سے جا کر اپنی پریشانی بتائی اور کہا آپ کی بڑی عنایت ہو اگر ہمیں اپنی کار میں گنگری بل تک پہنچا دیں۔ بولیں "ہمارا گاڑی تو بہت چھوٹا ہے۔ وہ ہم سے ایک ہمارا ڈرائیور ہے۔ تم دو لوگ کیسے آئے گا۔" بلقیس نے کہا "ہم دونوں کسی نہ کسی طرح بیٹھ جائیں گے" لیکن وہ نہ مانیں۔ کہنے لگیں "گھبراؤ نہیں تمھیں تانگہ کیے دیتے ہیں۔" ہم اور ڈرے کہ آٹھ سات میل رات کے وقت تانگے میں اکیلے کیسے جائیں گے؟ ہمیں پریشان دیکھ کر پہلے تو اطمینان دلاتی رہیں پھر بہت طنز سے کہنے لگی "او تم ہندوستانی عورت اتنا ڈرپوک کیوں ہوتا ہے۔ تانگہ کا مرد کیا تم کو پکڑ لے جاتے گا؟" مجھے بڑا غصہ آیا۔ آئی کہیں سے انگریز کی دم۔ چار سے عیسائی ہو گئیں تو دماغ آسمان پر پہنچ گئے لیکن مرتا کیا نہ کرتا غصہ کو پی کر چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لی۔ باہر اکا دکا تانگے کھڑے تھے مس نیلی نے آواز دی "تانگہ .... او ٹانگہ" ایک تانگے والا سر سے پیر تک سیاہ کمبل لپیٹے آگے بڑھا "کہاں جانا مانگتا مس صاحب؟" مس صاحبہ نے فرمایا "دیکھو ان دونوں مس صاحب کو گنگری بل لے جاؤ۔ انعام ملے گا۔ راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔" تانگہ والے نے مستعدی سے جواب دیا۔ "نہیں مس صاحب بڑے آرام سے لے جاؤں گا۔" تانگہ چھوٹا سا مگر بڑا خوبصورت اور بالکل نیا تھا۔ اور گھوڑا بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں ڈرتے دل ہی دل میں دعائیں مانگتے اللہ کا نام لے کر تانگہ پر سوار ہو گئے۔ مس نیلی

نے کہا" اوہ تانگہ نمبر لو لوا بنا" میں نے نہیں سنا تانگے والے نے کیا نمبر بتایا
میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ تانگے والا ہمیں کہیں لے جا کر مار ڈالے
تو مس نیلی اس کا نمبر لے کر کیا چاٹا کریں گی۔ ہمارا تانگہ اور ان کی موٹر روانہ
ہوئی۔ مس نیلی نے ہاتھ اور دانت نکال کر کہا "چیریو" اور میرا جی چاہا کہ گردن ریلے
ایک زور سے چپت۔ ظاہر دار خود پرست دوست ذرا سی تکلیف نہ اٹھائی
گئی۔ خود موٹر چلا رہی تھی ڈرائیور کو تانگہ پر بھیج کر ہمیں آسانی سے بٹھا سکتی تھی
مگر ہائے اس نئی تہذیب کی خود غرضیاں ....

تانگہ تیزی سے چلا جا رہا تھا اور اس سے زیادہ تیزی سے ہمارے
دل۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے۔ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد
ذرا خود ہی دل کو ڈھارس دی کہ تو یہ ہم ناحق بیسویں صدی میں پیدا ہوئے
بھلا ایسا بھی کیا ڈر ہے .... یہ سوچ کر کچھ تقویت ہوئی آپس میں چپکے
چپکے باتیں کرنے لگے۔ پہلے تو خوب دل کھول کر مس نیلی کو برا بھلا کہا اور ضمناً
یہ بھی کہ کہیں تانگے والا کہیں اور لے گیا تو .... ؟ پھر یہ ذکر کہ گھر پر سب
پریشان ہوں گے اور ان پر غصہ کہ ہمیں اکیلا چھوڑ کر سب چل دئے۔ اس
سلسلے میں بلقیس کو نفیس پر بہت غصہ تھا۔ کہنے لگی ٹھیر جاؤ کیسا ٹھیک بناتی ہوں
بات بھی نہیں کروں گی۔ میں نے کہا اور اپنے دونوں بھائیوں کو نہیں کہتیں
کہ اپنی اپنی بیویوں کو لے کر چلتے بنے۔ مگر اسے اپنے نفیس پر زیادہ غصہ تھا
اور بات بھی ٹھیک تھی ابھی سے بچاری بلقیس کو جگہ جگہ بھولنے لگے تو آئندہ
کیا کریں گے ؟ بلقیس کو چھیڑتی بھی رہی۔ باتوں کے جوش میں نہ تو ڈر یاد

رہا اور نہ یہ خیال رہا کہ ہم اس آواز سے بات کر رہے ہیں کہ تانگے والا سب سن رہا ہے۔ اب جو خیال آیا تو چپ ہو گئے مگر اب تانگے والے کی طرف سے اطمینان سا ہو گیا تھا کہ اتنے میں تانگے والے نے گانا شروع کیا۔ پہلے تو سمجھ میں نہ آیا کیا گا رہا ہے۔ پھر جو غور سے سُنا تو غالب کی غزل "رنج کہ سے ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے" گا رہا تھا۔ بڑی پاٹ دار آواز اور سریلا گلا تھا اور لب و لہجہ نہایت صاف۔ ہم نے حیرت اور خوف سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نے تانگہ اور تیز کیا اور آواز یا ذرا اونچی۔ بلقیس کی تو ڈر کے مارے چیخ نکل گئی "او تانگے والے تانگہ دھیما کر۔" مگر وہ گانے میں ایسا محو تھا کہ کچھ نہیں سُنا۔ میں نے اس کے کمبل کو کھینچا اور ذرا رعب دار آواز بنا کر کہا "ارے سنتا نہیں تانگہ آہستہ کر" اس نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کی بجلی کی روشنی میں کمبل کے اندر سے دو سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں " اچھا صاحب اچھا۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔" میرا دل بلیوں اچھلنے لگا زور سے بلقیس کا بازو تھام لیا۔ اس نے تانگہ دھیما کیا اور کہنے لگا "سرکار کہیں تو روز تانگہ سیر کے لئے لے آیا کروں۔" میں چپ رہی بلقیس نے کہا "نہیں ہمیں نہیں چاہیئے" تانگہ والا بولا اب موٹروں کا زمانہ تو گیا پٹرول ہی نہیں ملتا اور حضور میرا تانگہ تو ہزاروں میں ایک ہے گھوڑا ایسا دوڑتا ہے کہ کیا کوئی موٹر مقابلہ کرے گی اور پھر میں سرکار سے کوئی زیادہ دام تھوڑا ہی لوں گا۔ بس حضور کی نظر عنایت کافی ہے۔" بلقیس نے ڈانٹ کر کہا "بکو مت ہمیں نہیں چاہیئے چپ چاپ چلو۔" تانگے والا کچھ دیر چپ رہا اور پھر حسرت کی غزل

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

گنگنانے لگا۔ یقین مانیو فرحت میں سر سے پاؤں تک تو پسینے میں تربتر تھی اور دل کا یہ حال کہ یہ معلوم ہو کہ اب چلتے چلتے پھٹ سے بند ہو جائے گا۔ دونوں منہ چھپائے ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے تھے۔ سڑک پر دو چار آدمی اب بھی آ جا رہے تھے۔ تانگے والے نے مڑ کر ہمیں دیکھا "حضور آپ اس قدر ڈرتی کیوں ہیں میں بھی شریف آدمی ہوں غریب ہوں تو کیا ہوا" جب ہم نے کچھ جواب نہیں دیا تو میری طرف مڑ کر عجیب سے لہجے میں یہ شعر پڑھا "منہ نہ دکھلا تو نہ دکھلا پر بہ انداز عتاب" کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے" وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کسی نے پکارا او تانگے والے تانگہ روک، میں نے دیکھا تو دو شخص کھڑے تانگے والے کو پکار رہے تھے تانگے والے نے بھی مڑ کر دیکھا اور بجائے تانگہ روکنے کے اور تیز چلانے لگا۔ اب آگے آگے تانگہ جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے وہ دونوں آدمی بھاگ رہے تھے۔ میں نے اپنی چوڑیاں اور انگوٹھیاں اور بندے جلدی سے اتار کر بٹوے میں ڈالیں اور ہاتھ میں لے کر تیار ہو بیٹھی کہ جب یہ تینوں بدمعاش (میں سمجھی کہ تانگے والا اور یہ دونوں آدمی ملے ہوئے ہیں) ہمیں مارنے دوڑیں گے تو یہ زیور دے کر اپنا پیچھا چھڑا لوں گی۔ مگر تانگہ تیزی سے چلتا رہا وہ دونوں آدمی پیچھے رہ گئے۔ بلقیس نے کہا "تانگے والے انسانوں کی طرح تانگہ چلا اتنا دوڑاتا کیوں ہے"۔ تانگے والے نے کہا "آپ

تو خواہ مخواہ خفا ہو رہی ہیں۔ خدا جانے کون بدمعاش تانگہ رکوا رہے تھے میں تو ڈر کے مارے تیز لے آیا کہ کوئی آفت نہ آجائے۔" آپ تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ یہ بھی ضرور ان ہی لوگوں سے ملا ہوا ہے میں نے بغیر زیادہ سوچے اپنا بٹوا تانگے والے کے ہاتھ میں دے دیا" بھائی خدا کے لئے تو یہ لے لے اور ہمیں ہمارے گھر خیریت سے پہنچا دے" اس نے کچھ تعجب سے میری طرف دیکھا اور بٹوا ہاتھ سے لے لیا۔ اب ہم دھارا جہ کے محل کو جو راستہ جاتا ہے اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میں نے دیکھا سامنے سپاہی کھڑا ہے اور دو تین شریف سے آدمی سڑک پر جا رہے ہیں۔ بجلی کی طرح میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے بلقیس سے کہا" بلقیس خیر چاہتی ہو تو تانگے سے کود پڑو" اور کہتے کے ساتھ ہی چلتے تانگے سے کود پڑی ....

تم جانو تیز چلتے تانگے سے پکی سڑک پر کود جانا کچھ کم خطرناک بات تو نہیں مجھے کودتے وقت ایک لمحے کے لئے یہ معلوم ہوا کہ ہوا میں اڑی جا رہی ہوں اور پھر بڑے زور کا جھٹکا لگا اس کے بعد کچھ خبر نہ رہی۔ ہوش آیا تو دیکھا اپنے پلنگ پر پڑی ہوں اور سارا گھر مع ایک ڈاکٹر کے میرے گرد جمع ہے امی جان نے رو رو کر آنکھیں سجا لی ہیں اور بلقیس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں مجھے ہوش میں دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ شکر ہے کہ کہیں کی ہڈی دڈی نہیں ٹوٹی ورنہ لطف آجاتا۔ دس پانچ جگہ خراش ضرور آئی تھی اور دو جگہ نیل پڑ گئے تھے۔

اب تقریباً بالکل ٹھیک ہوں۔ جب تنہائی ہوئی تو میں نے بلقیس سے حال دریافت کیا تو معلوم ہوا۔

مجھے گرتا دیکھ کر بلقیس نے بے تحاشا چیخیں ماریں شروع کیں۔ تانگے والے نے مڑ کر دیکھا اور چلتے تانگے ہی سے وہ اور بلقیس دونوں کود پڑے اور دوڑتے ہوئے میرے پاس پہنچے۔ میں سڑک کے بیچوں بیچ چاروں خانے چت بے ہوش پڑی تھی اور آس پاس پولس کا سپاہی اور دو تین راہ گیر جمع تھے۔ بلقیس نے پہلے تو مجھے ہوشیار کرنے کی کوشش کی پھر غصہ میں تانگے والے کی طرف پلٹی کہ اسے پکڑوا دے تو کیا دیکھتی ہے کہ تانگے والے کا کمبل الگ پڑا ہے اور سفید آڑے پاجامہ اور سیاہ اچکن میں پریشان حال منہ پر ہوائیاں حواس باختہ ...... پرویز کھڑا .... مجھے تک رہا ہے ....

لوگوں کی پوچھ گچھ پر اس نے کہا یہ دونوں میری عزیز ہیں۔ ہم لوگ سیر کر کے واپس گھر جا رہے تھے۔ تانگہ تیز جا رہا تھا۔ یہ لڑکی بے خیال بیٹھی تھی گر گئی۔ بلقیس کہتی ہے کہ میں بدنامی کے باعث چپ ہو گئی۔ کاش مجھے ہوش ہوتا تو حضرت کو اسی وقت پولس کے حوالے کرتی۔ خیر دونوں نے اٹھا کر مجھے تانگہ پر ڈالا اور گھر تک لائے۔ راستے بھر پرویز بلقیس سے اظہار شرمندگی کرتا رہا اور بے حد معافی مانگی کہ میں نے تو محض مذاق کیا تھا۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آپ کی بہن اس حد تک مجھ سے بدگمان ہو جائیں گی اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ بہر حال بلقیس نے گھر آ کر صرف یہ کہا

کہ ہم شالا مار سے واپس آ رہے تھے کہ ہمارا تانگہ ایک درخت سے لڑ گیا نیلوفر اس میں سے گر گئی اور چوٹ آئی۔ اتفاق سے اُدھر سے نفیس کے دوست پرویز اپنے تانگے پر جا رہے تھے انھوں نے ہمیں دیکھ لیا اور گھر پہنچا گئے

بلقیس نفیس بھائی سے اب تک خفا ہے۔ یوں بھی اس نے سب ہی کو لتاڑا اور شرمندہ کیا۔ مگر خدا جانے پرویز نے اس پر کیا منتر پھونکا ہے کہ اس کی بدتمیزی و بے ہودگی کو بھول کر اس کی تعریفیں کرتی رہتی ہے اور مجھ سے ہر وقت یہ سفارش ہے کہ اسے معاف کردو! بے وقوف!! پرویز دن میں دو دو مرتبہ خیریت پوچھنے آتا ہے۔ گھنٹوں ماموں ابا، دولھا بھائی اور نفیس بھائی کے پاس بیٹھتا ہے۔ جب وہ آیا ہوا ہوتا ہے تو میں کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتی۔

کل نفیس بھائی میرے پاس آئے "نیلوفر بلقیس سے میرا قصور معاف کرادو تو تمھیں ایک چیز دوں"۔ میں نے کہا بھائی قصور تو آپ کا ہرگز قابلِ معافی نہیں۔ لیکن میں سفارش کردوں گی آگے آپ کی قسمت۔ یہ سن کر وہ مسکرائے اور ایک سیاہ چمڑے کا بٹوا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا "لو یہ اپنا بٹوا پرویز نے دیا ہے"۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کہ کہیں اس بدتمیز نے سب کچھ نفیس بھائی سے تو نہیں کہہ دیا؟ میں مجرم سی بنی کھڑی تھی کہ انھوں نے یہ کہہ میرا اطمینان کردیا۔ "پرویز کہتا تھا کہ جب میں آپ کی بے ہوش بہن کو لے کر آیا تو ان کا بٹوا میرے تانگے پر رہ گیا تھا۔ کئی دن میری میز پر پڑا رہا دنیا یاد نہیں رہا تھا"۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ٹٹوا کھولا۔ سب زیور اور روپیہ جوں کا توں تھا۔ صرف میری ایک انگوٹھی بدلی ہوئی تھی۔ میری انگوٹھی سادی سونے کی تھی اور ایک موتی نگ کی جگہ جڑا تھا اس کے بجائے ایک دوسری انگوٹھی تھی جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے موتی اور بیچ میں سرخ یاقوت جڑا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے اور بھی غصہ آیا اس شخص کی اتنی جرأت؟ پھر جو ٹٹوے کو ٹٹولا تو اس میں سے ایک پرچہ اور ایک چھوٹی سی پرویز کی تصویر نکلی۔ تصویر کے ایک کونے پر لکھا تھا "گنہ گار پرویز" اور پرچے میں نہایت خوشامد سے مجھ سے معافی مانگی تھی اور کہیں کہیں دو ایک فقرے بھی کسے تھے جو باوجود اس پر غصے کے مجھے پسند آئے۔ آخر میں انگوٹھی کے بدل لینے کی معذرت کی تھی اور لکھا تھا "اگر میرا قصور معافی کے قابل ہو تو یہ انگوٹھی قبول کر لیجئے اور مجھے دو سطر کا پرچہ لکھ بھیجئے گا کہ میں نے معاف کیا۔ میں نے تصویر تو چھپالی پرچہ اور انگوٹھی بلقیس کو دکھائی۔ بلقیس کا اصرار تھا کہ انگوٹھی رکھ لوں اور معافی نامہ لکھ بھیجوں۔ مگر میرا خون اس رات کی باتیں یاد کر کے غصے سے کھول جاتا ہے۔ میں ہرگز اسے معاف نہیں کروں گی۔ چہ میگوئیوں اور بدنامی کے ڈر سے یہ بات کسی سے نہیں کہی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ میں نے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہرگز نہیں! کبھی نہیں!! میں نے انگوٹھی بلقیس کو دے دی کہ یہ اسے واپس کر کے میری انگوٹھی لا دو۔ بلقیس نے اگلے دن میری انگوٹھی مجھے دے دی اور نہایت افسوس سے کہنے لگی "نیلوفر تم ایک سچے چاہنے والے کو ٹھکرا رہی ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ انگوٹھی لیتے

وقت پرویز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔ جلدی سے چلی آئی۔ یہ بات اچھی نہیں کہ کسی کا دل یوں توڑا جائے۔" میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا منہ پھیر کر چپ ہو گئی۔

میری فکر نہ کرنا میں اب اچھی ہوں دو چار جگہ خراش باقی ہے مگر میرے دل میں عجیب قسم کی خلش رہتی ہے بار بار اس شخص کی طرف سے غصے اور نفرت کی لہر اٹھتی ہے اور بے چین ہو جاتی ہوں۔

ابھی میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ بلقیس اور نفیس مسکرا مسکرا کر آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ چلو اچھا ہوا۔ دونوں میں صلح ہو گئی۔

جواب بہت جلد دینا میں بہت اداس ہوں۔

تمہاری پریشان

نیلوفر

۱۵ اگست ۴۲ء
سری نگر

پیارے جاوید۔ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ تم جیسا رومان پرست شاعر مجھے
یوں لعنت ملامت کرنے لگے گا۔ یہ سچ ہے کہ جو حرکت میں نے کی وہ اچھی
نہیں تھی۔ بے شک میرے حماقت آمیز مذاق نے اس معصوم اور شریف
لڑکی کو اس قدر تکلیف پہونچائی۔ اس میں میرا قصور اتنا نہیں جتنا میرے
بھیس بدلنے کا ہے۔ کالج میں ڈراموں میں پارٹ کرتے کرتے مجھے اپنی ہیئت
اور آواز بدل لینے کی ایسی مشق ہوگئی ہے کہ میں نے بغیر کسی کوشش کے
ایک بدمعاش تانگے والے کا پارٹ نہایت کامیابی سے کیا میں سمجھتا تھا کہ
نیلوفر تھوڑی دیر بعد مجھے پہچان لے گی اور پھر میں اس سے باتیں کرسکوں
گا۔ بس اتنا ہی میرا مقصود تھا۔ میں نے افسانوں اور ناولوں میں بھی یہی پڑھا
اور تم جیسے رومان پرستوں سے بھی سُنا کہ آج کل لڑکیاں بھی بہت رومانی

ہو گئی ہیں اور اس قسم کی باتوں کو وہ بہت پسند کرتی ہیں۔ وہ اب مردوں سے ڈرتی نہیں۔ بلکہ ان سے میل ملاقات بڑھانا چاہتی ہیں اور ایسے واقعات سے جن میں رومانیت ہو بہت محفوظ ہوتی ہیں۔ اور ایسے نوجوانوں کو پسند کرتی ہیں جن میں جرأت اور چالاکی ہو۔ کچھ تم لوگوں کی ان خیالات کی تصدیق کا شوق تھا۔ اور کچھ (اب سچ بات ہی کیوں نہ بتا دوں) مجھے اس لڑکی سے دلچسپی بھی ہو گئی تھی۔ اسی لئے میں نے یہ چال چلی جب میں نے دیکھا کہ ان کی پارٹی کے بہت سے لوگ موٹر میں چلے گئے تو میں نے نفیس سے کہہ دیا کہ سب لوگ گئے تم ڈونگے میں چلے جاؤ۔ وہ ہمیشہ کا احمق بغیر دیکھے بھالے نوکروں کو لے ڈونگے پر چلتا بنا اور آخر جیسا کہ میرا خیال تھا ان دونوں لڑکیوں کو میرا ہی تانگہ کرنا پڑا جو میں نے پہلے ہی منگا لیا تھا۔ تانگے کے نوکر کو چلتا کیا اور اس کا کمبل یہ کہہ کے لیا کہ میں اوورکوٹ بھول آیا ہوں اپنا کمبل مجھے دے دے۔ جب میرا سارا پلین حسب منشا طے ہو گیا تو پھر کیا میں دو چار شعر بھی نہ گاتا یا ایک آدھ فقرہ ڈرانے کے لئے بھی نہ کہتا۔ اس سے زیادہ نیلوفر اس بات سے خوف زدہ ہوئی کہ میرے دو جاننے والوں نے تانگہ روکنے کی کوشش کی اور میں نے اس خوف سے کہ یہ لوگ مجھے پہچان نہ لیں تانگے کو بہت تیز کر دیا شاید وہ یہ سمجھی کہ یہ لوگ بھی اس سے ملے ہوئے ہیں یا شاید اس نے خیال کیا کہ یہ جو اُن سے ڈر کر بھاگا ہے تو ضرور اس کی نیت خراب ہے۔ جب نیلوفر نے اپنا زیور کا بٹوا میرے ہاتھ میں پکڑایا تو مجھے اس کا سان دگمان بھی نہ تھا کہ یہ تانگے سے کودنے پر تیار ہے مگر اس

نے تو سچ مچ اپنی جان تک کی پروا نہ کی اور دھم سے کود ہی پڑی۔ وہ مجھ سے ناراض ہے تو حق بجانب ہے۔ مگر تم مجھے ملامت کرنے والے کون؟ جب کہ تم اس سے بھی زیادہ بے ہودہ حرکتیں کر چکے ہو۔ لڑکیوں کے تانگوں کے پیچھے پیچھے سائیکل لے کر کالج تک ان کو پہنچانا اور تانگے والوں کو گانٹھ کر ان کے پاس پرچے بھیجنا تو تمہارا بڑا پسندیدہ مشغلہ تھا! کیوں غلط کہتا ہوں؟ اچھا تم جتنا چاہے مجھے بُرا بھلا کہہ لو میں تو خود ہی کہتا ہوں کہ میں نہایت قابلِ ملامت ہوں خود میرا ضمیر ہر وقت نیش زنی کرتا رہتا ہے مجھے غصہ اپنے پر ہے کہ میں نے نیلوفر کو کیوں تمہاری ہیروئن لڑکیوں جیسا سمجھا۔ یہ تو ان سب کے برعکس عجیب کٹر دل کی لڑکی ہے جو کسی طرح رام ہی نہیں ہوتی۔ میری جگہ تم ہوتے تو ایسی بزدل، بے وقوف لڑکی کو دور ہی سے سلام کرتے کہ بیسویں صدی کی لڑکی اور ایسی ڈرپوک اور اس قدر غیر شاعرانہ طبیعت!! مگر جاوید اس کی یہی ادا میرا دل چھینے لیتی ہے۔ آج کل کی لڑکیوں میں بھی ایسی شریف اور باحیا لڑکیاں موجود ہیں!!! کم سے کم تم لوگوں نے ہمیشہ مجھے اس کے برعکس ہی اپنے (جھوٹے سچے) تجربات سنائے۔ اگرچہ میں ہمیشہ سے یہی سمجھتا ہوں کہ شریف خاندانوں کی لڑکیوں میں غیرت، حیا اور عزت کا پاس اب بھی پوری طرح موجود ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا جوہر ہے۔

نیلوفر کے ہاں کے سب مردوں سے میری ملاقات ہو گئی ہے نفیس تو اپنا دوست ہی ہے۔ بلقیس (نفیس کی منگیتر) میری بڑی مداح ہے اور میرے سامنے بھی آتی ہے۔ مگر نیلوفر پر اس کی سفارشوں کا بھی کوئی اثر نہیں

ہوتا۔ ہر بات کا ڈھی جواب دیتی ہے کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس رات ان کی نیت نیک تھی اگر میں کود نہ پڑتی تو خدا جانے کیا ہوتا؟ جاوید اس کے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس پر غصہ کے بجائے پیار آتا ہے! میں نے اس کا بٹوا واپس کیا تو ایک پرچہ (معافی نامہ) اور اپنی ایک تصویر بٹوے میں رکھ دی تھی اور نیلوفر کی ایک انگوٹھی رکھ کر اس کے بدلے ایک نئی انگوٹھی بازار سے خرید کر رکھ دی اور یہ درخواست بھی کی کہ اگر میں معافی کے قابل سمجھا جاؤں تو یہ انگوٹھی قبول کر لینا۔ مگر میری قسمت کہ اس نے میری انگوٹھی واپس کر دی اور اپنی منگا لی۔ اس وقت مجھے حد سے زیادہ رنج ہوا اور سخت شرمندگی۔ مگر ایک بات سے میری تصویر رکھ لی اس سے تھوڑی سی امید بندھتی ہے کہ شاید اس کے دل میں میری کچھ جگہ ہو پھر خیال آتا ہے ممکن ہے غصہ میں جلا کر پھینک دی ہو!

اب تو مجھے ہر وقت یہ فکر ہے کہ کسی طرح موقع ملے تو زبانی نیلوفر سے معافی مانگوں مگر اس کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس نے بلقیس اور نفیس کے ساتھ سیر کو جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ سنا ہے ہر وقت افسردہ رہتی ہے اور زرد پڑ گئی ہے۔ پرسوں نیلوفر کے سب گھر والے گل مرگ جا رہے ہیں۔ مجھ سے بھی اصرار ہوا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ جاؤں گا ضرور مگر سب سے چھپ کر میں نے ایک نئی بات سوچی ہے شاید اس طرح مجھے نیلوفر سے بات کرنے اور معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ اب میری قسمت ممکن ہے کہ وہ مجھے معاف کر دے اور یہ بھی ممکن ہو کہ وہ میری اس دوسری حرکت سے اور زیادہ ناراض

ہو جائے۔ بہر حال اب تو دیکھنا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ شاید تم کہو کہ تمہیں
اس سے معافی مانگنے کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ نہیں معاف کرتی تو نہ کرے
وہ اپنے گھر خوش تم اپنے گھر۔ مگر نہیں جاوید جب تک وہ مجھے معاف
نہیں کر دے گی۔ مجھے چین نہ ملے گا۔ تم جس قدر چاہے میرا مذاق اڑاؤ (اور
اب تمہیں اس کا حق بھی ہے کیا میں تمہارا مذاق برسوں نہیں اڑا چکا ہوں؟)
مجھے پروا نہیں مجھے نیلوفر سے وہ محبت نہیں جو پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔
ایسی محبت جو محض صورت دیکھ کر ہو وقتی اور ناپائیدار ہوتی ہوگی۔ مجھے
صورت دیکھ کر اس سے دلچسپی پیدا ہوئی پھر اس کی طبیعت اور خیالات کا
اندازہ ہوا جو بہت کچھ مجھ سے ملتے ہوتے ہیں۔ اب اس کے ہاں زیادہ
آتے جاتے رہنے کی وجہ سے اس کے سگھڑاپے اور سلیقے کا حال کھلا۔ اس
کی تعلیم اور سلجھے ہوئے مذاق کا حال نفیس اور ملقیس سے معلوم ہوا۔ اس میں
وہ سب صفات موجود ہیں جو میں اپنی بیوی میں چاہتا ہوں اور جن کا برسوں
سے خواب دیکھتا رہا ہوں اور خیال تھا کہ ساری عمر خواب ہی دیکھتے کٹے
گی۔ مگر اب میرے خوابوں کی دیوی مجسم میرے سامنے موجود ہے لیکن
مجھ سے بیزار۔ نفیس کہتا ہے کہ میں شادی کی درخواست کروں ضرور قبول
ہو گی۔ مگر جب تک نیلوفر مجھے معاف نہ کر دے اور اپنے دل میں جگہ نہ
دے لے میں اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں اس پر نہیں اس کے دل پر قبضہ
کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھو میری قسمت بن گئی لیکن اگر وہ بدستور
خفا رہی تو جاوید سمجھ لو کہ تمہارا دوست ہمیشہ کے لئے ناکام اور محروم زندگی

بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ میں نیلوفر کے علاوہ اب کسی سے بیاہ نہ کروں گا۔ اور شاید دنیا کی اور دلچسپیاں بھی میری توجہ اپنی طرف نہ کر سکیں گی۔
میں پرسوں کس بھیس میں جاؤں گا یہ نہیں بتاتا لیکن یہ بتائے دیتا ہوں کہ اس میں میری بھیس بدلنے کی قابلیت کا امتحان ہے! دوست میری کامیابی کی دعا کرتے رہنا۔

تمھارا

پرویز

۱۰ ستمبر ۴۲ء
سری نگر

فرحت میری بہن ۔ خوش رہو ۔ مبارک تمھاری نسبت ہو گئی ۔ تم نے
خود اطلاع کیوں نہ دی ؟ مجھ سے بھی پردہ داری ۔ ہم تو تمھیں ذرا ذرا سی
بات لکھ دیں ۔ اور تم یوں تکلف کرو ۔ اب اگر تم نے اپنے دولھا کا نام نہ لکھا
تو خفا ہو جاؤں گی اور خط کبھی نہیں لکھوں گی ۔ میں سخت بے چین ہوں کہ نہ
جانے تمھاری نسبت کس سے ہوئی ہے ؟ پیام تو کئی جگہ سے بڑے زور
شور سے آ رہے تھے ۔ کہیں اس بڈھے پوسٹ ماسٹر رشید سے تو نہیں
ہو گئی ؟ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے یا اس احمق شکل کے لمبے سوکھے
ناظم سے ہوئی ہے جس کی شکل کا تم کارٹون بنایا کرتی تھیں ؟ یا ان نازک
مزاج نازک دماغ بنے سنورے شاعر (جو باتیں بھی شاعرانہ انداز میں بن
بن کر کرتے تھے) جاوید سے ہوئی ہے ۔ جن کو ہم خیال کی دنیا کا بسنے

والا کہتے تھے؟ ان سے ہوتی ہے تو میں خوش ہوں وہ خیال پرست شاعر
سہی صورت شکل مزاج عادات انسانوں کے سے تو ہیں۔ بندر تو نہیں
لگتے۔ خیر ہوئی تو جاوید صاحب ہی سے ہوگی مگر یقین جب ہی آئے گا
جب تم خود اپنے دست نازک سے اپنے نازک ادا منگیتر کا نام لکھو گی۔

اپنے خط میں تم نے میرا خوب مذاق اڑایا مجھے تم سے یہ امید نہ
تھی میں تمھیں اپنے دل تک کا حال لکھ دیتے ہوں مگر تم کہتی ہو کہ میں کچھ
چھپا رہی ہوں! یہ غلط ہے یہ بھی ایک رہی کہ "نیلوفر تم پرویز سے نفرت
نہیں کر رہی ہو، اس خفا نہیں ہو بلکہ تم اس پر فدا ہو چکی ہو، اس سے
محبت کر رہی ہو اور اسے نفرت کے پردے میں چھپاتی ہو۔ تم خود نہیں
جانتیں کہ تمھیں اس پر اتنا غصہ کیوں ہے اچھا میری خاطر اپنا دل ٹٹول
کر دیکھو کہ اس میں کتنے فیصدی غصہ اور نفرت ہے اور کتنی محبت اگر تم
سچ مچ اس سے متنفر ہوتیں تو اس کی تصویر چھپا کر نہ رکھ لیتیں۔ کیوں پکڑی
نہ چوری؟" بھئی واہ فرحت تم بھی اپنے پر سب کو قیاس کرتی ہو۔ تصویر
تو ایسے ہی بے خیالی میں رکھ لی تھی۔ خیر اب دل ٹٹولنے کی ضرورت نہیں
رہی۔ تمھارا خط آنے سے پہلے ہی وہ تو ٹٹولا جا چکا ہے کیسے؟ لو سنو۔

اگست کے مہینے میں اتوار کی صبح ہم لوگ دولھا بھائی کی موٹر میں
گل مرگ روانہ ہوئے۔ صفیہ آپا، دولھا بھائی، بلقیس، نفیس اور میں بس
ہم ہی پانچوں تھے اور ایک نوکر رحمان ساتھ تھا۔ دس بجے کے قریب
تنگ مرگ پہنچے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے کوئی آٹھ سات ہزار فیٹ

بلند ہوگی ایک طرف حسین دریا فروز پورنالہ پورے زور شور سے کف اڑاتا ہوا بہتا ہے۔ دوسری طرف سرسبز پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ دولھا بھائی نے نفیس بھائی سے کہا جاکر پانچ گھوڑے گل مرگ جانے کے لئے کرایہ پر لے آؤ۔ تھوڑی دیر بعد نفیس بھائی گھوڑے لے کر آگئے صفیہ آپا کو تو یہاں رہتے رہتے گھوڑے پر چڑھنے کی مشق ہوگئی ہے جلدی سے سوار ہو گئیں۔ دولھا بھائی تو بڑے اچھے شہ سوار ہی ہیں اور نفیس بھائی بھی اب رہ گئے بلقیس اور میں۔ آج تک کبھی گھوڑے پر کاہے کو بیٹھے تھے عجب سین تھا ہم دونوں سہمے کھڑے تھے۔ بلقیس کہتی نیلوفر بیٹھ جاؤ نا پھر میں بیٹھ جاؤں گی۔ میں جواب دیتی کیوں میں کیوں پہلے بیٹھوں تم بڑی ہو تم پہلے سوار ہو پھر میں بھی چڑھ جاؤں گی۔ نفیس بھائی اصرار کر رہے ہیں۔ لڑتی کیوں ہو۔ دونوں ہی نہ بیٹھ جاؤ۔ بلقیس تو نفیس پر بہادری جتانے کو کسی نہ کسی طرح بیٹھ گئی۔ مگر میرا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ جب نفیس بھائی کا سہارا لے کر چڑھنے کو تیار ہوتی تو گھوڑے کے جسم کو پاؤں لگتا اور میں چیخ مار کر پرے ہٹ جاتی۔ دولھا بھائی اور صفیہ آپا ہنسی کے مارے دہرے ہوئے جاتے تھے بلقیس فقرے پر فقرے کس رہی تھی۔ نفیس خفا ہو رہے تھے کہ بیٹھ بھی چکو پر میں کیا کروں جب اراده کرتی پاؤں اس کے جسم کو چھوتا اور میں گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ صفیہ آپا اور ان کے میاں تو یہ کہہ کر آگے چلتے ہوئے کہ بھئی تم تو شام تک پہنچو گی۔ ہم تو جاتے ہیں۔ بلقیس نے کہا میں بھی جاتی ہوں تم دونوں یہیں رہو۔ دیکھا تو سارے گھوڑے والے مجھے

دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے مجھے غصہ بھی آیا اور شرم بھی جلدی سے نفیس بھائی کے سہارے دانت بھینچ کر سوار ہو ہی گئی۔ دو چار منٹ تو بڑا ڈر لگا مگر جب گھوڑا چلا تو پتہ لگا کہ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہی تھی۔ بڑا سیدھا ٹٹو تھا۔ اور سب نے تو گھوڑے والوں کو ہٹا دیا مگر میرے اور بلقیس کے گھوڑے لگام وہ تھامے چلتے رہے۔ میرے گھوڑے پر ایک دس گیارہ برس کا لڑکا تھا۔ میں نے کہا یہ تو زرا سا لڑکا ہے مجھے گرا نہ دے۔ نفیس بھائی کسی ہوشیار آدمی سے کہئے وہ آکر گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے۔ یہ سن کر ایک لمبا سا بڈھا کشمیری، بھدا سا کشمیری وضع کا کرتا پہنے سر اور کانوں پر سیاہ رنگ کا پرانا سا مفلر لپیٹے۔ چھاج سی سفید ڈاڑھی ہلاتا آگے بڑھا اور میرے گھوڑے کی لگام تھام کر چلنے لگا۔

کچھ دور تک تو ہم تینوں ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر بلقیس کو شوق چرایا تو اس نے اپنا گھوڑا دوڑایا اور آگے نکل گئی۔ کچھ دور تک تو نفیس بھائی بچارے دل مارے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر آخر کہاں تک جی نہ مانا تو وہ بھی آگے بڑھ کر بلقیس کے ساتھ ہو گئے اور تھوڑی دیر میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں آرام سے آہستہ آہستہ چلتی رہی اور مجھ سے کچھ پیچھے ہمارا بڈھا نوکر رحمان تھا۔ اب میرا خوف بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے لگام خود تھام لی اور گھوڑے والے سے کہا تم ساتھ ساتھ آؤ۔ اس نے ایک درخت کی پتلی سی شاخ میرے ہاتھ میں دے دی اور میں بھی بلقیس کی ریس میں خوب تن کر اور اپنے خیال میں بڑی شہ سوار بن کر گھوڑا دوڑانے کی کوشش کرنے

لگی مگر وہ میرا گھوڑا تو سچ مچ کا اڑیل ٹٹو تھا۔ تیز چلنے کا نام ہی نہ جانتا تھا۔ میں نے کہا اے گھوڑے والے یہ تمھارا گھوڑا کیسا مریل ہے اس سے تو چلا ہی نہیں جاتا۔" کہنے لگا "مس صاحب جی یہ تو ایسا دوڑتا ہے کہ بڑی بڑی میم صاحب اس پر جان دیتی ہیں۔" جان دینے کا لفظ پر مجھے ہنسی آگئی میں نے کہا "ہاں تم لوگوں کو باتیں بنانا تو خوب آتی ہیں بھلا دیکھیں تو تمھارا گھوڑا کیسے دوڑتا ہے۔" یہ سن کر اس نے پیچھے سے گھوڑے کو ٹھیلا اور "ٹخ ٹخ" جو کی تو وہ فراٹے بھرنے لگا اور میرا ڈر کے مارے برا حال۔ گھوڑے پر دوہری ہوگئی اور چیخی "ارے روک گھوڑا روک میں گری۔" بچارا بڈھا گھوڑے والا گھوڑے کے ساتھ دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا تھا اس نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ کیا مگر وہ خود گھوڑے سے زیادہ ہانپ رہا تھا مجھے ہنسی بھی آئی اور رحم بھی "بڑے میاں تم تو ہانپنے لگے۔" بولا "مس صاحب جی یہ پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔" میں نے پوچھا "تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے یہ تو بڑا سخت کام ہے اس عمر میں اتنی سخت چڑھائی پر چڑھنا اترنا تو بہت کھلتا ہوگا۔" ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "مس صاحب جی کیا پوچھتی ہو۔ بہت چاہا کوئی اور کام مل جائے پر نہیں ملتا۔ آخر اس ٹٹو کے مالک کے ہاں نوکر ہو گیا جو مزدوری ملتی ہے اس میں سے آدھی مالک لے لیتا ہے باقی میں، بری بھلی طرح میرا پیٹ پل جاتا ہے۔" میں نے افسوس سے کہا "بچارا بڈھا! کتنا روز کما لیتے ہو بڑے میاں۔" کہنے لگا "دس بارہ آنے کل مرگ آنے جانے کا کرایہ مل جاتا ہے آدھا مالک کو دے کر پانچ چھ آنے مجھے بچ جاتے ہیں۔ کبھی آپ جیسے دیالو

کچھ انعام بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح گزر ہو رہی ہے۔" شروع میں تو وہ کشمیری لوگوں کے لہجے میں بولتا رہا مگر پھر تو اچھی خاصی صاف اردو میں باتیں کرنے لگا مجھے بڑا تعجب ہوا میں نے پوچھا "بڑے میاں تم کشمیری تو لگتے نہیں بڑی صاف اردو بولتے ہو۔" بڈھا پہلے تو کچھ گھبرا سا گیا پھر مسکرا کر کہنے لگا مس صاحب جی آپ نے خوب پہچانا میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔ مگر نصیب کی گردش نے یہاں لا ڈالا۔" مجھے اور بھی رحم آیا کہ ہائے بچارا اس عمر میں وطن سے اتنی دور یہاں مصیبت میں دن کاٹ رہا ہے۔ بڑے میاں آخر تم یہاں کیوں پڑے ہو؟" اس نے جواب دیا "میرا قصہ بڑا دردناک اور لمبا ہے بھلا آپ کو کیا سناؤں" یہ سن کر مجھے اس کا قصہ سننے کا شوق پیدا ہوا اصرار کرنے لگی بڑے میاں ضرور اپنا قصہ سناؤ میں بڑے شوق سے سنوں گی یہ سن کر وہ چپ ہو گیا۔ باتوں میں پتہ ہی نہ چلا تھا کہ آدھے کے قریب رستہ طے ہو چکا ہے اب جو دیکھتی ہوں تو ایک موڑ پر چاروں ساتھی پتھر پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں مجھے دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہاں رہ گئیں تھیں شکر ہے کہ تمھاری صورت تو نظر آئی وغیرہ وغیرہ۔ میں تو ان لوگوں کی خود غرضی پر پہلے ہی سے جلی ہوئی تھی "آپ لوگوں کو کیا مطلب کوئی پیچھے رہ جائے، گر جائے، مر جائے آپ تو تیز چلے آتے"، بلقیس بولی "تم ہو ہی پھسڈی کب سے ہم سب تمھارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" دولھا بھائی نے کہا "نیلوفر کو ہماری صحبت پسند نہیں اکیلی اکیلی مزے سے آ رہی تھیں" میں نے چڑ کر جواب دیا۔ بجا درست۔ آپ یہ نہ کہیں گے تو اور کون کہے گا۔ سب سے پہلے صفیہ آپا کو لے کر آگے

چلتے بنے آپ کی رلیں ان دونوں کو بھی آئی یہ بھی آنکھ بچا مجھے اکیلا چھوڑ فرار ہوگئے بچارا گھوڑے والا بڈھا ساتھ نہ ہوتا تو میں کسی کھڈ میں آرام کرتی ہوتی۔ اب تو میں اکیلی ہی گل مرگ جاؤں گی۔ آپ دو دو کی جوڑی الگ جائیے" دولہا بھائی سیدھے آدمی شرمندہ ہوگئے صفیہ آپا نے مسکرا کر کہا "گستاخ"۔ بلقیس کھسیانی ہنسی ہنسے لگی اور نفیس نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "کہاں ہے وہ تمھارا بڈھا رفیق"۔ قصہ مختصر ہم لوگ پھر روانہ ہوئے۔ بلقیس شرمندگی مٹانے کو اب میرے ساتھ ساتھ ہی رہی میں نے کہا بھی کہ "جاؤ تم اپنے نفیس کے ساتھ جاؤ میرے ساتھ کیوں آرہی ہو" چڑ کر کہنے لگی "تمھیں کیوں حسد ہوتا ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ پرویز کو بھی ساتھ لے چلیں تمھارا بھی جوڑا۔۔۔۔۔۔۔۔" میں نے بات کاٹی "چپ بدتمیز شرم نہیں آتی بے ہودہ باتیں کرتے"۔ اب بلقیس نے حسب عادت پھر وہی پرانا راگ چھیڑا دیا۔ میں نے کہا یہ گھوڑے والا خوب اردو سمجھتا ہے۔ الٹی پلٹی باتیں نہ کیجو۔ یہ سن کر اس نے (ٹوٹی پھوٹی) انگریزی بولنی شروع کردی یہ خوف تو تھا نہیں کہ کوئی اور سن رہا ہے لہذا دونوں خوب غلط سلط انگریزی چھانٹتے رہے بلقیس کہتی وہ تیری خفگی کے رنج میں گھلا جارہا ہے کون سا اس نے ایسا قصور کیا جو تو معاف نہیں کرتی؟" میں نے کہا تم قاضی کہ مفتی۔ جاؤ نہیں کرتے معاف پھر میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو اس سے کیا غرض کہ میں اس سے خفا ہوں کہ خوش۔ آخر پرویز سے مجھ سے واسطہ کیا؟ خدا جانے پرویز نے بلقیس پر کون سی بُرکی چھڑک دی ہے کہ ہر وقت اس کا کلمہ پڑھتی ہے

اور مجھ سے جلی کٹی کرتی رہتی ہے۔ بدتمیز کہنے لگی" بتاؤں کیا واسطہ، محبت کا واسطہ وہ تمھارا سچا چاہنے والا ہے اور تم ہو کہ مزاج ہی نہیں لئے بیٹھے ہیں پرویز کی جگہ ہوتی تو ایسی ضدی اور مغرور لڑکی پر تھوکتی بھی نہیں خدا جانے اسے تجھ میں کیا لال لگے نظر آتے ہیں " میں نے زچ ہو کر کہا" خدا کے لئے بلقیس اس قصہ کو ختم کرو۔ تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا میں پہلے ہی اپنی جان سے بیزار ہو رہی ہوں اور پھر ہر وقت کے تمھارے طعنے۔ میں تو کشمیر آ کر بڑا پچتائی " بلقیس یہ سن کر نرم ہو گئی محبت اور سنجیدگی سے بولی "میری نیلو تم خواہ مخواہ مجھ سے خفا رہتی ہو۔ تم نے کبھی سنجیدگی سے اس پر غور کیا ہے کہ یہ تمھاری خفگی بالکل بے جا ہے تم دراصل خفا ہو ہی نہیں۔ اگر غصہ ہوتا تو اتنی افسردہ نہ رہا کرتیں ضرور تم کسی اور ہی فکر میں رہتی ہو میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ الگ کو چلنے لگی اب گل مرگ بھی آ گیا تھا۔ ایک طرف سبزے پر ہم سب بیٹھ گئے اور کھانا نکال کر کھانے لگے۔ کیونکہ ایک بج گیا تھا اور سب کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھا رہے تھے۔ سارے گھوڑے والوں نے آ کر کھانے کے لئے "بخششیں" مانگی مگر میرا بڈھا چپ چاپ الگ بیٹھا رہا ہے بھائی نے کہا ارے اس بڈھے کو بھی کچھ دے دو۔ میں نے ان سے کہا وہ کشمیری نہیں۔ ہماری طرف کا رہنے والا ہے اسے کھانا ہی دے دیں گے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے ایک برتن میں تھوڑا تھوڑا سب کھانا رکھا اور لے جا کر گھوڑے والے کو دیا۔ اُس نے شکر گزار نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور

بڑے شوق سے کھانے لگا۔ وہ اس قدر دلچسپی اور شوق سے کھا رہا تھا کہ میں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ آخر مجھ سے ضبط نہ ہوا "معلوم ہوتا ہے تم بہت بھوکے تھے" اس نے جواب دیا "مس صاحب جی کشمیری کھانا کھاتے کھاتے میں اپنی طرف کے کھانوں کا مزا ہی بھول گیا تھا۔ آج مدتوں بعد یہ کھانے دیکھنے کو ملے ہیں (چٹخارہ لے کر) بڑے مزے کے ہیں کیا آپ نے پکائے ہیں" کہنے لگا "یہی سب سے اچھے ہیں" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "ایک زمانہ تھا کہ میں بھی ایسے عمدہ عمدہ کھانے روز کھایا کرتا تھا"۔ مجھے پھر اس کا قصہ سننے کا شوق پیدا ہوا اس سے یہ کہہ کر واپسی میں تمھارا قصہ ضرور سنوں گی اپنے ساتھیوں میں آملی دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ دولھا بھائی نے کہا میں تو اپنے ایک دوست کے ہاں جاتا ہوں اور صفیہ کو بھی ان کی بیوی سے ملنا ہے چاہو تو تم لوگ بھی چلو مگر ہم نے یہ صلاح کی کھلن مرگ (گل مرگ سے ساڑھے تین میل دور گیارہ ہزار فیٹ کی بلندی پر ایک میدان ہے) چلنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ دونوں ادھر گئے اور ہم تینوں پھر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کھلن مرگ کی طرف چلے۔ میں نے بڈھے سے کہا بھی کہ اگر تم تھک گئے ہو تو میں کسی اور آدمی کو ساتھ لے لوں مگر اس نے کہا نہیں میں ہی ساتھ چلوں گا۔ میں نے سوچا بیچارہ غریب آدمی ہے چاہتا ہے کچھ اور مزدوری مل جائے۔ ایک ٹفن باسکٹ میں چائے اور ناشتہ کا سامان بھی رحمان ساتھ لے کر پیچھے پیچھے آنے لگا اب تو میرا ڈر بھی نکل گیا تھا مزے سے گھوڑا چلاتی رہی۔ حالانکہ غضب کی چڑھائی ہے مگر ٹٹو اس قدر سدھے

ہوتے ہوتے ہیں کہ کیا بتاؤں ایسی احتیاط سے چڑھتے ہیں کہ کوئی آدمی بھی کیا اس سے زیادہ ہوشیاری سے چڑھے گا۔

نفیس بھائی سب سے آگے ان کے پیچھے بلقیس اور اس کے پیچھے میں۔ راستہ اتنا تنگ ہے کہ دو گھوڑے برابر برابر نہیں چل سکتے۔ میں نے گھوڑے والے سے کہا "ہاں بڑے میاں اب سناؤ اپنا قصہ تمھارے کوئی بیوی بچے بھی ہیں؟ یہاں کیوں رہتے ہو۔ گھوڑے والا کچھ دیر تک خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا ایک ہاتھ گھوڑے کی پشت پر رکھا تھا اور دوسرے سے اپنی ڈاڑھی کھجا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کہنے لگا "مس صاحب جی میرا قصہ بڑا دردناک ہے آپ کو بھی سن کر رنج ہوگا۔ میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔ میرے ماں باپ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے اور میں ان کا اکلوتا بیٹا۔ انھوں نے مجھے کچھ لکھا یا پڑھایا بھی تھا مجھے سیر سپاٹے کا بڑا شوق تھا۔ ۲۷ یا ۲۸ برس کی عمر میں میں سارے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کر چکا تھا۔ مگر اب تک کشمیر نہیں دیکھا تھا آخر ایک سال میں نے یہاں آنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ اس زمانے میں موٹریں اور بسیں تو تھی نہیں۔ لوگ تانگوں اور گھوڑوں پر آتے جاتے تھے۔ میں نے بھی راولپنڈی سے ایک تانگہ کیا اور ایک نوکر کے ساتھ روانہ ہوا دو تین دن میں دومیل تک آرام سے پہنچ گیا۔ وہاں تانگے والے نے مجھ سے کہا کہ "دو عورتیں کئی دن سے یہاں پڑی ہیں ان کا تانگہ ٹوٹ گیا ہے اور کوئی خالی تانگہ ملتا نہیں آپ اجازت دیں تو اس میں بٹھا لوں"۔ میں نے اجازت دے دی اور وہ عورتیں اگلے

دن سے میری ہم سفر ہو گئیں۔ وہ دونوں پردہ دار تھیں۔ مگر تین چار دن کے سفر میں میں نے دونوں کی جھلک دیکھی۔ بوڑھی عورت ماں تھی اور دوسری جوان لڑکی جس کی عمر شاید ۱۸ یا ۱۹ برس کی ہو گی اس کی بیٹی تھی۔ بیٹی کی شکل بڑی بھولی اور دلکش تھی اور مس صاحب کیا کہوں آنکھیں تو غضب کی تھیں راستہ میں ماں بیٹی نے مجھے کھانا بھی پکا کر کھلایا۔ بس ایسا مزے کا کھانا یا تو جب کھایا تھا یا پھر آج حضور نے کھانا کھلایا اس کا مزا بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔"
میں بڑی محویت سے بڈھے کا قصہ سن رہی تھی مگر کھانے کا ذکر سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ پھر بڈھے کی شکل پر نظر پڑی تو اس کا چہرہ بڑا افسردہ نظر آیا مجھے اپنی بے وقت کی ہنسی پر شرمندگی سی محسوس ہوئی اور میں نے جلدی سے کہا "ہاں پھر کیا ہوا؟" بڈھے نے ایک لمبا سانس بھرا "مس صاحب وہ لڑکی ایسی شریف اور ایسی خوبصورت تھی کہ مجھے اس سے ایک قسم کا اُنس پیدا ہو گیا۔ سری نگر پہنچ کر ماں نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پھر وہ دونوں کہیں چلی گئیں۔ میں نے "ڈل" کے اندر ایک ہاؤس بوٹ کرایہ پر لیا۔ اور وہاں رہنے لگا۔ مگر میرے دل میں بار بار اس لڑکی کا خیال آتا اور اس کی بھولی بھالی شکل آنکھوں کے سامنے آ جاتی۔ ایک دن میں "چار چنار" کے جزیرے سے شکارے میں واپس آ رہا تھا کہ میں نے ایک شکارے میں ان ماں بیٹی کو دو مردوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ ماں نے اشارے سے مجھے ان مردوں کو دکھایا اور بیٹی نے مجھے دیکھ کر منہ چھپا لیا! اتفاق دیکھو کہ وہ لوگ میرے برابر والے ہاؤس بوٹ میں جو شاید دو تین دن ہوئے وہاں

آیا تھا آکر اترے۔ خیر کچھ دن میں میرا ان سب لوگوں سے ملنا جلنا ہو گیا کبھی سیر کرتے کراتے اور کبھی ہاؤس بوٹ کی کسی کھڑکی وڑکی میں سے مجھے اس لڑکی کی جھلک نظر آجاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ لوگ چشمہ شاہی پر گئے۔ میں بھی گیا اور ایک جگہ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اس سے بات کرنی چاہی۔ شاید میں نے کوئی ایسی بات کہی تھی جس سے اظہار محبت ہو یا کوئی شعر پڑھا تھا ـــــــ ٹھیک یاد نہیں ـــــــ بات بھی تو بیس پچیس برس ادھر کی ہے اور بڑھاپے نے حافظہ بھی خراب کر دیا ہے۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ میری اس حرکت سے وہ خوف زدہ ہو گئی خدا جانے اس نے مجھے کوئی بدمعاش سمجھا یا کیا، کہ وہ بے تحاشا وہاں سے بھاگی اور جلدی جلدی سیڑھیوں سے اترنے لگی اور گھبراہٹ میں گر گئی۔ اس کے بہت چوٹ آئی۔ کئی دن تک بستر پر پڑی رہی یقین جانیئے مس صاحب یہ چوٹ اس کے تو جسم پر لگی تھی اور میرے دل پر۔ میں شرمندگی ندامت اور رنج سے تڑپتا رہا۔ مگر کچھ بس نہ تھا۔ جی چاہتا تھا جا کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دوں، اس کے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگوں اور اس کی تیمارداری اپنے ہاتھ سے کروں مگر میں بھلا کون تھا محض ایک اجنبی! میری تو اتنی بھی مجال نہ تھی کہ کسی سے اچھی طرح اس کی طبیعت کا حال بھی دریافت کر لوں۔ خدا بھلا کرے اس کی ملازمہ کا جسے میرے حال پر رحم آگیا اور وہ مجھ سے ہمدردی کرنے لگی۔ میں نے اس کی معرفت زبانی بھی اور خطوں سے بھی لڑکی سے معافی مانگی لیکن اس نے مجھے معاف نہیں کیا بلکہ ملازمہ سے کہدیا کہ خبردار اس کا ذکر بھی مجھ سے

نہ کرنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ مجھے اس کی بے رخی اور نفرت کا سخت صدمہ ہوا مگر یہ عجیب بات تھی کہ اس سے محبت بڑھتی جاتی تھی۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اُسی کا خیال اسی کا دھیان رہتا کبھی جی چاہتا ــــــ ڈل میں کود کر خودکشی کر لوں، کبھی سوچتا منہ چھپا کر کسی جگہ نکل جاؤں میری پریشان حالت دیکھ کر میرے ایک مخلص دوست نے مجھے ایک مشورہ دیا اور بہت سوچ بچار کے بعد میں نے سوچا کہ لاؤ اس پر عمل کر کے دیکھوں شاید قسمت یاوری کرے ...."

بڈھے کا قصہ سنتے سنتے خدا جانے کیوں میرا دھیان اپنے سفر اور اس کے بعد کے واقعات کی طرف چلا گیا اور میں گہری سوچ میں پڑ گئی۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ممکن ہے پرویز بھی اپنی فطرت سے برا آدمی نہ ہو بلکہ اس لڑکی کی طرح مجھے بھی غلط فہمی ہوئی ہو کئی منٹ بعد میں چونکی بڈھا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا میں نے کہا ہاں کیا مشورہ دیا تھا تمہارے دوست نے بڈھا پہلے کچھ سوچتا رہا پھر بولا میں نے دوست کے مشورے کے مطابق لڑکی کے باپ کو شادی کا پیام دیا۔ چند دن پوچھ گچھ کرنے کے بعد انھوں نے اسے منظور کر لیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ابھی سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دونوں جہان کی دولت مل گئی۔ مگر ہائے میری بدقسمتی نے یہاں بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا؛" میں نے گھبرا کر جلدی سے پوچھا "کیا ہوا کیا وہ لڑکی مر گئی؟" بڈھے نے بیساختہ کہا "خدا نہ کرے۔ ہوا یہ کہ دس بارہ دن بعد لڑکی کے باپ نے مجھے بلا کر افسوس

سے یہ کہا کہ وہ بعض وجوہ سے میرے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی نہیں کر سکتے اور بہت معذرت بھی کی مِس صاحب بھلا آپ کو کیا خبر کہ یہ سن کر مجھ پر کیا گزری۔ میری عجیب حالت ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ سچی محبت ہمیشہ محبوب کے دل پر اثر کرتی ہے مگر میرا محبوب ایسا سخت دل تھا کہ اس پر کوئی چیز اثر ڈال ہی نہیں سکتی تھی پھر بھی ابھی تک امید کا ایک تار لگا ہوا تھا؛" بڈھا چپ ہو گیا۔ میں نے بیتابی سے پوچھا" پھر کیا ہوا؟" بڈھے نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ خواب کے سے عالم میں بولتا رہا" پھر کیا ہوا؟ پھر کیا ہوا؟ شاید یہ ہوا کہ وہ اپنے وطن چلی گئی اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہو گئی اور میری امید کا آخری تار بھی لوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی......" میں نے اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کر کے دھیمے لہجے میں کہا" پھر تم اپنے وطن کیوں نہ چلے گئے؟ یہاں کیوں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہو؟" بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھری" کشمیر ہی میری پہلی اور آخری محبت کا گہوارہ ہے یہیں میں نے اپنے محبوب کا جلوہ دیکھا اور یہیں اس کی بیوفائی کا داغ اٹھایا — میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں اسے چھوڑ کر کہیں اور جاؤں اب نہ دل میں حوصلہ تھا نہ ارمان نہ آرزو تھی نہ خلش، بس یاس اور نا امیدی کا عالم تھا اور عجب افسردگی سی دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ پھر نہ میں نے وطن کا رخ کیا نہ مجھے معلوم کہ وہاں سب کا کیا انجام ہوا — اور اب دیکھ لیجئے ایسی یاس کے عالم میں زندگی بسر کرتے کرتے یہ لمبی سفید ڈاڑھی ہو گئی

ہے۔ شاید میری محبوبہ کو یہ بھی یاد نہ ہو کہ کسی بدنصیب شخص نے اس سے
کبھی محبت کی تھی مگر میں۔۔۔۔میں" اس کی بڑی بڑی آنکھیں سے آنسوؤں
کے شفاف قطرے اس کی لمبی سفید ڈاڑھی پر مسلسل گر رہے تھے اور اس کے
ساتھ ساتھ میں بھی رو رہی تھی۔ میں تو کوئی غمناک افسانہ پڑھتی ہوں تب
بھی رونے لگتی ہوں اور یہ تو ایک بڑھے مصیبت زدہ کا اپنا افسانہ غم
تھا کیسے نہ روتی۔ ساتھ ہی پرویز کا دھیان آرہا تھا فرحت تم سے
کیا پردہ آج مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ حقیقت میں مجھے پرویز
سے نفرت نہیں، اس پر غصہ نہیں بلکہ بلکہ خیر جانے دو
بہر حال یہ اندازہ ہو گیا کہ میں اپنی ہٹ میں خواہ مخواہ اس سے اظہار
نفرت کر رہی ہوں۔ اس کے قصوروں کی میرا دل سینکڑوں تاویلیں
کر رہا تھا اور ساتھ ہی یہ وسوسہ پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں پرویز کا بھی ایسا ہی
انجام نہ ہو؟ بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح پرویز سے
دو باتیں کر سکوں اور اس کو یہ بتا دوں کہ مجھے تم سے نفرت نہیں نہ
میں تم سے خفا ہوں۔ خدا جانے میں کب تک اپنے خیال میں غرق رہی
دیکھا تو کھلن مرگ کا میدان سامنے نظر آرہا ہے اور گھوڑے والا لگام
پکڑے چل رہا ہے۔

کھلن مرگ پہنچ کر کچھ دیر ادھر ادھر پھرے بڑی غضب کی ٹھنڈی
ہوا تھی۔ پھر وضو کر کے نماز پڑھی اور بہت مشکل سے اسپرٹ کا چولھا
جلا کر چائے بنائی اور پی۔ مگر میری طبیعت پریشان اور میں اداس تھی

بلقیس نے کہا بھی کہ نیلوفر تمھیں کیا ہوا اور ستو بڈھے کا قصہ عجیب عادت ہی کسی نے جھوٹا سچا قصہ گھڑ کر سنا دیا اور آپ اس پر رنج کرنے بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا نہیں بلقیس میں تھک گئی ہوں اور کوئی بات نہیں۔ واپسی میں میں نے گھوڑے پر چڑھنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ غضب کا آزار تھا بلقیس اور نفیس بھائی بھی میرے ساتھ پیدل ہی روانہ ہوئے۔ آدھی دور تک ہم سب پیدل آئے مگر مجھے بہت تکان ہوگیا تو میں پھر گھوڑے پر بیٹھ گئی اور وہ دونوں آگے آگے پیدل روانہ ہوگئے کچھ دور چلی ہوں گی کہ ایک شفاف پانی کا چشمہ بہتا نظر آیا میں نے کہا میں تو یہاں اتر کر پانی پیوں گی اور ذرا استاؤں گی بھی۔ بڑے میاں نے سہارا دے کر مجھے اتارا اور میں نے ایک پتھر پر بیٹھ کر خوب منہ ہاتھ دھویا پانی پیا اور بیٹھ گئی رحمان نے بھی ٹفن باسکٹ وہاں رکھ دی اور خود ایک طرف چلا گیا میں نے دیکھا کہ گھوڑے والا چلو میں پانی لے لے کر اپنے پاؤں پر ڈال رہا ہے میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا کچھ نہیں۔ میں نے قریب جا کر دیکھا اس کے دونوں پاؤں کیچڑ اور مٹی میں لت پت تھے اور بائیں پاؤں کی ایڑی میں مسلسل کنکر چبھتے رہنے سے زخم ہوگیا تھا اور سرخ سرخ خون نکل رہا تھا۔ میں گھبرا گئی "ہے ہے بڑے میاں تمھارا تو پاؤں زخمی ہوگیا لاؤ ادھر میں اسے دھو کر پٹی باندھ دوں نہیں تو پک جائے گا" اس نے جلدی سے اپنا پاؤں سمیٹ لیا "نہیں نہیں حضور آپ تکلیف نہ کریں۔ سب ٹھیک ہے۔ ہم لوگوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں" میں نے اصرار سے کہا "واہ یہ

بھی خوب کہی ۔ بڑھاؤ ادھر پاؤں ! اس نے میری طرف دیکھا اور ہچکچاتے
ہوئے اپنا پاؤں میری طرف بڑھایا ۔ میں نے چشمہ سے پانی لے کر اس
کا پاؤں دھویا تو خاصا صاف ستھرا پاؤں نکل آیا مگر ایڑی کا چھتیا چھتیا خون
دیکھ کر میرا دھیان اس کے پاؤں کی طرف نہیں گیا سب سے تو یہ فکر تھا کہ
کسی طرح یہ خون بند ہو جائے میں نے رحمان کو آواز دی کہ ٹفن باکٹ
میں سے اسپرٹ لے آئے ۔ اس نے اسپرٹ لا دیا مگر تعجب سے مجھے
دیکھنے لگا ۔ میں نے زخم پر اسپرٹ ڈالا اور اپنا ریشمی رومال بڈھے کی ایڑی
پر بل دے دے کر کس کر باندھ دیا ۔ اس نے بڑی شکر گزار نظروں سے
میری طرف دیکھ کر کہا " آہ آپ کتنی اچھی ہیں! " میں نے اسے زبردستی
اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور خود رحمان کے ساتھ ساتھ گل مرگ پہنچی ۔ رات
کو ہم سب لوگ دولھا بھائی کے دوست کے ہاں ٹھیرے ۔ اور لوگ
تو تھک کر بڑی گہری نیند سوئے مگر دو تین بج گئے اور مجھے نیند نہ آئی ۔ کبھی
بڈھے گھوڑے والے کی داستان یاد آتی کبھی پرویز کی نازیبا حرکت
کا خیال آتا اور کبھی اپنی سختی اور ناراضگی کا مجھے حیرت تھی کہ گھوڑے والے
کا اور ہمارا قصہ کتنا ملتا جلتا ہے ۔ کیا پرویز کو بھی سچ مچ ایسی سچی محبت ہے
جیسی اس بڈھے کو اپنی محبوبہ سے تھی ؟ کیا میری خفگی کا اثر اس کے دل
پر بھی اسی قدر گہرا ہوا ہوگا ۔ مگر یہ تو بڑا شریف آدمی معلوم ہوتا ہے
—— لیکن پرویز بھی تو شریف ہے آخر اس نے ایسی کون سی ذلیل حرکت
کی جس پر میں اسے ذلیل اور کمینہ سمجھوں ؟ بلقیس اور نفیس سارے سارے

دن باتیں کرتے ہیں، ساتھ رہتے ہیں ہنسی مذاق ہوتا ہے اگر پرویز نے مجھ
سے بات کرنی چاہی تو کون سا غضب ہو گیا ——— مگر یہ بڈھا کیسی صاف
زبان بول رہا تھا ——— بہت بڈھا تو ۔۔ نہیں ——— پر ڈاڑھی تو بڑی لمبی
سی اور بالکل سفید تھی ——— اس کا پاؤں کیسا صاف اور نرم تھا تعجب
ہے کسی غریب گھوڑے والے بڈھے کا ایسا نرم پاؤں ؟ اس خیال کا آنا
تھا کہ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی ——— اس کی آواز ؟ کچھ سنی ہوئی سی تھی۔ مگر کہاں
سنی، کب سنی ——— اور ——— اور اس کی آنکھیں ہاں اس کی آنکھیں بھی
تو کسی سے ملتی ہیں ؟ کس سے ملتی ہیں ؟ شاید ——— پر ———
مجھے اختلاجی کیفیت شروع ہو گئی اٹھ کر ٹہلنے لگی ——— بلقیس نے آنکھیں
کھول کر مجھے دیکھا " اے نیلوفر تم سوئیں نہیں کیا بات ہے ٹہل کیوں رہی
ہو ؟" میں نے گھبرا کر جواب دیا " کچھ نہیں تھک گئی ہوں نیند نہیں آتی اور
اختلاج سا ہو رہا ہے۔ خیر نہیں کیا ہو گیا " بلقیس نے کہا " بہت تھک گئی
ہو اور زیادہ بلندی کی وجہ سے بھی بعض لوگوں کو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے
آؤ میرے پاس آ کر لیٹ جاؤ " بلقیس نے مجھے اپنے پلنگ پر لٹا لیا اور
میرا سر سہلانے لگی۔ میں بھی اپنے خیالات دل سے ہٹانے کی کوشش کرنے
لگی اور تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی ۔

صبح کو ہم لوگ نو کے قریب سو کر اٹھے۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ
ہو کر اور میز بانوں سے اجازت لے کر گیارہ بجے ہم تنگ مرگ روانہ
ہوئے۔ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت دیکھا کہ میرا بڈھا گھوڑے والا

غائب ہے اس کی جگہ ایک لڑکا کھڑا ہے۔ میں نے پوچھا بڈھا کہاں گیا۔ اس پر ایک شخص نے جواب دیا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا کل ہی تن مرگ چلا گیا۔ مجھے بڑا افسوس ہوا میرا ارادہ تھا کہ کرایہ سے زیادہ انعام دوں گی مگر وہ غریب تو بیمار ہو کر چل ہی دیا!

سب سے آگے نفیس بھائی اور دولھا بھائی جا رہے تھے بیچ میں صفیہ آپا اور ان کے پیچھے بلقیس اور میں باتیں کرتے آ رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص خاکی برجس خاکی زین کا کوٹ پہنے سر پر فلٹ ہیٹ ذرا زیادہ جھکائے گھوڑا چمکا کر ہمارے برابر سے گزرا۔ ہم دونوں بے خیال اسی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا، ہیٹ اٹھا کر سر کو ذرا جھکا کر سلام کیا اور آگے بڑھ گئے میں نے خوف زدہ ہو کر کہا "بلقیس یہ کون تھا؟" وہ بولی "میں کیا جانوں کون ہے مگر ہے بد تمیز" اب جو سامنے دیکھتے ہیں تو وہ شخص دولھا بھائی اور نفیس بھائی کے برابر باتیں کرتا جا رہا ہے۔ نفیس بھائی پاس آئے تو بلقیس نے پوچھا "یہ کون ہے؟" انھوں نے ہنس کر کہا "میرا ایک دوست" میں نے کہا "عجب بد تمیز آدمی ہے ابھی ادھر سے گذرا تو ہمیں دیکھ ٹوپی اتار لی" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے "یہ بد تمیزی کی بات تھی کہ تمیز داری کی" میں نے کہا "جی ہاں بڑی تمیز داری" بلقیس بولی "آخر نام بتائیے نا کون ہے؟"——
نفیس نے شرارت سے میری طرف دیکھا "پرویز ہے" میں اچھل پڑی۔ بلقیس خوش ہو کر بولی "یہ کہاں سے ٹپک پڑے؟" نفیس نے

جواب دیا "کل شام کسی دوست کے ساتھ گل مرگ آتے تھے۔ ہم نظر آئے تو وہ انھیں چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلے آئے۔ آخر ہمارے قافلہ میں زیادہ کشش ہے نا" بلقیس بولی" اچھا ہوا نیلوفر یاد بھی کر رہی تھی" وہ دونوں بدتمیزی سے ہنستے رہے اور میں چپ چاپ غصے میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔ پرویز نے گھوڑا آہستہ کر لیا اور قریب آ گئے۔ میں نے نقاب ڈال لی اور دھڑکتے دل کو ہاتھ سے دبا لیا۔ بلقیس نے کہا" نفیس پرویز صاحب سے میرا اسلام تو کہو" یہ سن کر پرویز بالکل بلقیس کے گھوڑے کے برابر اپنا گھوڑا لے آئے اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ میں ادھر سے ذرا گردن موڑے الگ الگ چلتی رہی۔ یکایک بلقیس کی آواز میرے کان میں آئی" ارے پرویز صاحب یہ آپ کے پاؤں میں کیا ہوا" میں نے بے اختیار ان کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ پشاوری سینڈل پر بائیں پاؤں پر روئی اور سفید پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے اوپر سبز کاہی رنگ کا ریشمی رومال میرا رومال میرا اپنا باندھا ہوا رومال تھا ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے زور سے میرے دل پر گھونسہ مارا میں اچھل پڑی، لگام میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اوندھے منہ ٹٹو سے نیچے آ پڑی۔

ذرا دیر کے لئے میں بدحواس سی ہو گئی۔ کسی کے دوڑنے کی آواز آئی اور چار ہاتھوں نے مجھے زمین سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میرا اوپر کا برقعہ اتر کر دور جا پڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر نظر اٹھائی تو دیکھا نفیس

بھائی مجھے تھامے کھڑے ہیں اور سامنے پرویز کھڑے پریشان نظروں سے
میری طرف دیکھ رہے ہیں اور بلقیس دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہے میں
نے ادھر ادھر دیکھا کہ منہ کس چیز سے چھپاؤں اور دونوں ہاتھوں سے
منہ چھپا کر بلقیس کی آڑ میں ہو گئی۔ پرویز شاید میری یہ حالت دیکھ کر خود
شرمندہ ہو گئے۔ کیونکہ کچھ سٹ کر پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے اب جو دیکھا
تو گرنے سے پیشانی میں ایک پتھر کی رگڑ لگ گئی تھی۔ اور خون نکل رہا تھا۔
بلقیس گھبرا گئی "ہے ہے کیا کروں" میں نے کہا "کچھ بھی نہ کرو معمولی گھسر
ہے ٹھیک ہو جائے گی" ادھر سے پرویز نے پکارا "بلقیس بہن دیکھئے
چوٹ کو پانی سے دھو کر اسپرٹ ڈال دیجئے ورنہ پاتزن ہونے کا ڈر ہے"
مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور میں نے بلقیس کو ہٹا کر کہا "جانے دو زیادہ
چوٹ نہیں لگی"۔ بلقیس نے کہا "واہ لگی کیسے نہیں" پرویز جا کر پاس کے
کسی چشمہ سے پانی لے آئے اور لا کر بلقیس کو دیا اب پھر میرا ان کا سامنا
ہوا میں نے آنکھیں جھکا لیں۔ بلقیس نے ماتھے پر بہت سا پانی ڈالا اور
اسپرٹ لے کر لگانے لگی۔ میں نے چڑ کر کہا "خواہ مخواہ کیوں میرا تماشا
بنا رہی ہو۔ میرے چوٹ نہیں لگی" پرویز نے پھر بلقیس سے کہا "بہن
مانیئے گا نہیں آپ اپنا کام کیجئے اور ہاں کچھ باندھ دیجئے گا۔ بلقیس نے
کہا "میرا رومال تو چھوٹا سا ہے نیلوفر تمھارا رومال کہاں ہے؟" میں
نے گھبرا کر کہا میرا رومال تو شاید کہیں گر گیا۔ نفیس بولے "میرا رومال
صاف نہیں۔ بلقیس تم اپنا دوپٹہ پھاڑ کر کیوں نہیں باندھ دیتیں؟" بلقیس

دوپٹہ پھاڑنے لگی تھی کہ پرویز نے بڑھ کر اپنا کاسنی رنگ کا خوبصورت ریشمی رومال بلقیس کے ہاتھ میں دیا اور کچھ مسکرا کر دبی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری عجیب حالت تھی کچھ جھینپ کچھ شرم کچھ خوف کچھ غصہ گونا گوں جذبات کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو گیا اور میں نے جھنجھلا کر بلقیس سے کہا بس اب ختم بھی کرو اس تماشے کو بلقیس نے میرے ماتھے پر پرویز کے رومال کی پٹی باندھی اور میرا سیاہ برقعہ اڑھا کر بولی" اب تو تم خاص الخاص عربن لگ رہی ہو"۔ میں نے کہا میں ہرگز گھوڑے پر نہیں بیٹھوں گی۔ یہ سن کر بلقیس نے کہا اچھا تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ بلقیس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور ہم دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ آخر میں نے اسے ہٹا کر کہا "تم خواہ مخواہ مجھے اپاہج بنائے دے رہی ہو ارے بھائی میرے چوٹ بہت معمولی لگی ہے"۔ بلقیس ہنسنے لگی تھوڑی دیر بعد بولی "کیوں دوست اب کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "کیا خیال؟" بولی" یہی پرویز کے متعلق کیا اب بھی بدستور ناراض ہو؟" خود بخود میری نظریں جھک گئیں اور میں کچھ جواب نہ دے سکی۔ وہ شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولی" اچھا یہ بات" اور قدم بڑھا کر آگے نفیس بھائی کے ساتھ ساتھ چل پڑی مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آیا کہ یہ کیوں مجھے چھوڑ کر چلدی۔ تھوڑی دور آگے بڑھی تھی کہ ایک درخت کے سہارے پرویز کو کھڑے سگرٹ پیتے دیکھا میں چاہتی تھی کہ چپکے سے آگے بڑھ جاؤں مگر انھوں نے مجھے دیکھ کر سگرٹ پھینک دیا اور آ کر میرے

ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چند منٹ تک دونوں خاموشی سے چلتے رہے آخر پرویز آہستہ سے بولے "اگر آپ اجازت دیں اور مجھے کمینہ اور رذیل نہ سمجھیں تو آپ سے دو ایک باتیں کرلوں؟" میں کچھ نہیں بولی۔ برقعہ کا پلو انگلی پر لپٹتی رہی۔ پرویز نے پھر کہا "کم سے کم اتنا بتا دیجئے کہ سر میں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا کہنے لگے "خدا کرے نہ آئی ہو مگر یقین نہیں آتا چوٹ سخت لگی ہے۔" میں نے ہمت کر کے کہا "خواہ مخواہ" کہنے لگے "مجھے بڑا رنج ہے کہ ہمیشہ میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے۔" میں خاموش رہی تو پھر بولے "پہلی مرتبہ بھی میری وجہ سے آپ کو اتنی سخت تکلیف اٹھانی پڑی اور اس مرتبہ بھی میرے ہی سبب سے چوٹ آئی۔" میں نے دل کڑا کر کے کہا "اس مرتبہ آپ کی وجہ سے کیوں؟" مسکرا کر جواب دیا "میرا خیال ہے کہ آپ مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں اور حسب عادت کود پڑیں۔" مجھے ہنسی آ گئی اسے ضبط کر کے اور سر جھکا کر کہا "میں خود تو نہیں کودی بلکہ لگام ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔" کچھ دیر پرویز خاموش رہے پھر بولے "میں نے اپنے پچھلے قصور کی کئی مرتبہ معافی مانگی خط کے ذریعہ بھی اور بلقیس بہن کی معرفت بھی مگر آپ نے ہمیشہ اسے ٹھکرا دیا انگوٹھی بھی نہایت ذلت سے واپس کر دی ــــــ مجھے اپنی ذلیل حرکت پر سخت شرمندگی اور ندامت ہے ــــــ بڑی مشکل سے میں نے اس مرتبہ زبانی اپنے قصوروں کی معافی مانگنے کا موقع حاصل کیا ہے اگرچہ یہ بھی خوف ہے کہ کہیں میری یہ

دوسری جرأت آپ کو اور زیادہ متنفر نہ کر دے۔ بہر حال اب تو میری قسمت کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ایک مرتبہ اپنے منہ سے مجھے بتا دیجئے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا یا میں ہمیشہ کے لئے معتوب ہو گیا ہوں" میں چپ رہی تو پھر" بولے خدا کے لئے بتائیے آپ کے جواب پر میری قسمت اور آئندہ زندگی کا انحصار ہے ——— کیا سچ مچ آپ کو مجھ سے نفرت ہے؟" پرویز کی آواز یہ کہتے کہتے بھاری ہو گئی میرے دل نے کہا اب وقت ہے کہ پرویز پر یہ ظاہر کر دو کہ تم اس سے نفرت نہیں کرتیں بلکہ۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ لیا اور رک رک کر کہا "آپ خواہ مخواہ شرمندہ کرتے ہیں ——— معافی کی بھلا کیا بات ہے" پرویز نے جھک کر میرے نقاب سے ڈھکے ہوئے چہرے کو دیکھا!" یہ آپ سچ کہہ رہی ہیں؟ کیا واقعی آپ نے مجھے معاف کر دیا" آہستہ سے میرے منہ سے نکلا "ہاں" پرویز کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا "کیا آپ کو مجھ سے نفرت نہیں۔ کیا بلقیس اور نفیس نے مجھ سے غلط کہا تھا کہ آپ مجھ سے دلی نفرت کرتی ہیں۔ بتائیے ——— بولئے" میں نے ہمت کر کے جواب دیا "ان دونوں کو تو جھوٹی سچی باتیں بنانے کی عادت ہے" وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بولے "نیلوفر میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ آپ نے مجھے جلا لیا، اگر آپ اسی طرح مجھ سے ناراض رہتیں تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ میری ساری زندگی تلخ ہو جاتی ——— نیلوفر آپ نہیں جانتیں ———

آپ میرے دل کی حالت نہیں جانتیں" وہ یکایک خاموش ہو گئے وہ
دور خلا میں دیکھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہنے لگے
آپ ایسا سخت پردہ تو نہیں کرتیں، راہ گیروں کے گھوڑے والوں
کے سامنے آتی ہیں، بلقیس بھی میرے سامنے ہوتی ہیں پھر اگر
آپ کو مجھ سے نفرت نہیں مجھے کمینہ اور خراب اخلاق و عادات
کا آدمی نہیں سمجھتیں مجھ سے بدگمان نہیں تو پھر مجھ سے منہ کیوں
چھپاتی ہیں؟ شاید میں اسی قابل ہوں،" یہ کہتے کہتے انھوں نے
چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ فرحت۔ میری بہن یہ ضرور بری بات تھی،
مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، اب بھی خیال آتا ہے تو شرم آتی ہے
لیکن اس وقت میرے دل نے یہی کہا کہ پرویز پر ثابت کردوں کہ میں
اس سے نفرت نہیں کرتی، اس سے بدگمان نہیں ہوں بے ارادہ میں نے
اپنی نقاب الٹ دی مگر آنکھیں چار ہوتے ہی میری نظریں زمین کی طرف
جھک گئیں۔ مگر مجھے احساس تھا کہ پرویز کی نظریں میرے چہرے پر گڑی
ہوئی ہیں۔ چند منٹ بعد پرویز نے کچھ کانپتی آواز سے پوچھا "نیلوفر
آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات اور پوچھوں؟" میں نے کہا "جی ہاں
پوچھیئے" کہنے لگے آپ نے وہ انگوٹھی کیوں اس قدر خفگی ...." میں
نے سوچا اس کا کیا جواب دے سکوں گی۔ جلدی سے ان کی بات کاٹ
کر کہا "ہاں یہ تو بتایئے آپ کے پاؤں کا اب کیا حال ہے؟" پرویز
جھجک کر پیچھے ہٹے، اور ان کی نظر اپنے پاؤں کی طرف گئی۔ جس پر

پشاوری سینڈل کے اوپر میرا سبز کاہی ریشمی رومال بندھا ہوا تھا اور جس کی وجہ سے وہ قدرے لنگڑا کر چل رہے تھے۔ حیرت سے مجھے دیکھا اور تعجب سے کہا "ہیں! آپ مجھے پہچان گئیں"۔ میں نے مسکرا کر کہا "بڑے میاں آپ بہت عقلمند سہی لیکن دوسروں کو بھی اتنا احمق نہ سمجھنا چاہیئے" اور یہ تو کہیئے کہ وہ آپ کی ڈاڑھی کیا ہوئی " پرویز کچھ جھینپے اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑے ان کے ہنسنے پر مجھے بھی بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں نے برقعہ کے کونے سے منہ چھپا لیا۔ وہ بولے "مجھے خوف تھا کہ میرے اس بہروپ کو اگر آپ پہچان گئیں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے سے بھی زیادہ ناراض ہو جائیں مگر میں آخر کیا کرتا اور کوئی تدبیر میری سمجھ میں ایسی نہیں آئی جس کے ذریعے میں آپ سے مل کر معافی مانگ سکتا کیا مجھے اسی بہروپ میں آپ نے پہچان لیا تھا"۔ میں نے آہستہ سے کہا "نہیں بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ میں اپنا رومال آپ کے پاؤں پر بندھا دیکھ کر ہی گھوڑے سے گری۔ لگام ہاتھ سے چھوٹ گئی"۔ پرویز کچھ شرارت اور معذرت کے لہجے میں بولے "تو گویا اس دوسری مرتبہ چوٹ لگنے کا باعث بھی میں ہی بدبخت ہوا"۔ خدا جانے کس جذبے کے ماتحت میرے منہ سے نکلا "خدا نہ کرے"۔ اور پرویز کی مسکراہٹ دیکھ کر میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تنگ مرگ بالکل قریب تھا، سامنے فاصلے پر نفیس اور بلقیس جاتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چاہا کہ تیزی سے بڑھ کر ان سے مل جاؤں کہ پرویز نے جیب سے وہی

انگوٹھی نکال کر مجھ سے کہا " نیلوفر۔ یہ اگرچہ گستاخی اور بہت بڑی جرأت ہے لیکن میں بڑی ہمت کر کے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہ انگوٹھی آپ کی خدمت میں پیش کروں تو اسے قبول کر لیں گی"۔ فرحت یہ سن کر میری عجیب حالت ہوئی۔ یہ میں جانتی تھی کہ انگوٹھی لے لینا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کا لینا کتنی بڑی ذمہ داری اور ہمت کا کام ہے۔ اگر کسی کو معلوم ہو گیا۔ امی جان نے پوچھ لیا کہ یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟ کیا جواب دوں گی! ادھر پرویز کی ملتجی نگاہیں، اور بڑے میاں کی من گھڑت کہانی کا پُر درد انجام پریشان کر رہا تھا ـــــ میں کئی منٹ تذبذب کے عالم میں تیز تیز چلتی رہی ـــــ دل بلیوں اچھل رہا تھا چہرہ پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پرویز نے کچھ دیر انتظار کیا آخر بڑی مایوسی سے انگوٹھی کی ڈبیا بند کر کے جیب میں رکھنے لگے فرحت اس کے معنے یہ تھے کہ پرویز یہ سمجھیں کہ میں ان سے نفرت کرتی ہوں اور ـــــ اور ـــــ بہر حال میں نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھ کر اتنا کہا" لائیے"! انھوں نے یہ سن کر جلدی سے انگوٹھی ڈبیا سے نکال لی ایک مرتبہ اپنے ہونٹوں سے لگایا اور قبل اس کے کہ میں سمجھ سکوں میرا بایاں ہاتھ پکڑ کر چھنگلی کی پاس والی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی ـــــ میری اور ان کی آنکھیں پھر چار ہوئیں اور اس مرتبہ پرویز کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں تاب نہ لا سکی۔ جلدی سے نقاب ڈال لی اور تقریباً بھاگ کر بلقیس کے برابر چلی گئی اور بڑی دیر تک

بات نہیں کر سکی۔

اماں جان نے میری چوٹ دیکھی تو بہت خفا ہوئیں کہ اب میں ہرگز اپنی بچی کو تم لوگوں کے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔ جب دیکھو میری بچی کے چوٹ لگتی ہے اور سب اچھے خاصے رہتے ہیں۔

خط تو نگوڑا شیطان کی آنت ہو گیا۔ تمھیں آج کل اتنی فرصت کہاں کہ میرے کھرے پڑھو پر کیا کروں کئی دن سے طبیعت پریشان تھی۔ کچھ شرمندگی، کچھ خوف، کچھ اس بہروپئے کی حرکت پر تعجب اور حیرت۔ آج تمھیں لکھ کر دل زرا ہلکا ہوا ہے۔ بلقیس ایک نئی خبر سنانے والی ہے۔ خدا کے لئے اس کے متعلق مجھے کچھ نہ لکھنا میری تو پہلے ہی کئی دن سے عجیب حالت ہو رہی ہے بس کیا بتاؤں!

ہمیشہ تمھاری

نیلوفر

۵ اکتوبر ۴۲ء

گلری پل. سری نگر

پیارے دوست۔ شادی کی دلی مبارک باد اور اپنے نہ آ سکنے کا افسوس
اور معافی۔ کاش میں تمہاری شادی میں شرکت کر سکتا مگر یقین کرنا بالکل مجبور تھا
عین تمہارے نکاح والے دن میرا "انٹرویو" تھا اس لئے نہ آ سکا۔ میری دلی خواہش
یہ ہے کہ تم مسز جاوید کو لے کر فوراً سری نگر روانہ ہو جاؤ۔ تاکہ تم جیسے رومانی
شاعر اور فرحت جیسی حسین دلہن اس خوبصورت اور دلکش جگہ پر اپنا ہنی مون
(یا بقول رومانی ادیبوں کے ماہ عسل) منائیں یہ جگہ "کوہ فیروزہ" سے کسی طرح
کم نہیں۔ مسز جاوید کو میرا اسلام شوق اور اشتیاق دید۔ ان سے کہنا اگر نئی
زندگی کی ابتدا کسی انتہائی حسین جگہ پر کرنا چاہتی ہیں تو فوراً یہاں تشریف لے
آئیں اور ضمناً اپنی دلی دوست کی نسبت میں بھی شرکت کر لیں۔

فرحت اور نیلو فر میں سخت دوستی اور نہایت راز دارانہ خط و کتابت
بھی ہے اور فرحت ہماری عزیز بھابی ہی نہیں پیاری سالی بھی بننے والی ہیں

بولو اب بھی یہاں آنے سے انکار ہے۔ سچ جاوید موسم بھی آج کل بہت خوشگوار ہے۔ تم آجاؤ تو لطف دوبالا ہو جائے آ و گے نا؟ میں ۲۴ تک تمہارا منتظر رہوں گا۔ ۲۵ کو ہماری باقاعدہ منگنی ہونے والی ہے۔ کہو مبارک۔

جاوید تم سمجھتے ہو میں آج کل بہت خوش ہوں۔ پھولا نہیں سماتا۔ یہ خیال ایک حد تک تو صحیح ہے۔ مجھے یہ توقع نہ تھی کہ مجھے نیلوفر جیسی بیوی مل جائے گی۔ ایسی لڑکی سے شادی ہونے کی امید پر میں بہت خوش ہوں اپنی قسمت پر نازاں ہوں اور آج کل تو (جیسا نوجوانوں کا قاعدہ ہے کہ محبت کی تکمیل کے وقت یہی سمجھتے ہیں) اپنے کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ متفکر اور پریشان بھی ہوں تم حیران ہو کہ پرویز جیسا لاابالی، بے پروا اور کھلنڈرا کس طرح محبت کے جال میں پھنس گیا اور کس طرح شادی کی آہنی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے خوشی سے تیار ہو گیا۔ دوست یہی نہیں بلکہ تمہارا لاابالی، بے پروا اور بے فکرا دوست اب سنجیدگی سے غور و فکر کا عادی بھی ہو گیا ہے وہ مستقبل کے متعلق بھی سوچنے لگا ہے۔ پرویز اب بدل رہا ہے اب وہ ایک دوسرا پرویز بن جائے گا۔

چند مہینے میں میری زندگی میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ جب پرویز دلی سے روانہ ہوا تو وہ ایک بے فکر لاابالی نوجوان تھا جو عورت سے گھبراتا تھا اور محبت کا منکر تھا۔ راولپنڈی سے سری نگر پہنچتے پہنچتے اسے عورتوں سے دلچسپی ہوئی اور ان کی عزت اس کے دل میں پیدا ہوئی چند دن گزرے تھے کہ وہ محبت میں اچھا خاصا مجنوں ہو گیا۔ ایک دھن، ایک سودا اس کے دماغ پر سوار

تھا کہ کسی طرح اپنی محبوبہ سے عفو تقصیر کرائے۔ اگرچہ وہ خود اس جذبے کو نہیں سمجھتا تھا۔ مگر اس کی حالت یہ تھی کہ اگر وہ اپنی مراد نہ پاسکتا تو شاید پاگل ہوجاتا محبت نے بری طرح اسے شکست دی تھی۔ لیکن برعکس اپنے مزاج کے اس نے اپنی طبیعت پر ایک حد تک قابو رکھا اور ایک راہ ڈھونڈی اور نہایت دانشمندانہ اور شریفانہ طریقے پر اپنی محبوبہ سے نہ صرف۔ فی مانگ لی بلکہ اس کے دل میں سوئے ہوئے جذبہ الفت کو بھی بیدار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب کیا باقی رہا تھا۔ اور کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہ تھی اپنے دو مخلص دوستوں نفیس اور بلقیس کی مدد سے وہ اپنی محبوبہ کی دائمی رفاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس کی درخواست شادی منظور کرلی گئی ہوتا یہ چاہیئے تھا کہ اس آرزو کے پورا ہونے کے بعد اس کی پرانی طبیعت اپنی اصلیت پر آجاتی اور پھر وہ وہی پہلے جیسا خوش فکر، خوش وقت، حال میں مگن رہنے والا پروانہ بن جاتا۔ مگر نہیں نیلوفر کی سچی محبت نے اس میں ایک اور انقلاب بھی کیا اور اسے غور و فکر کا عادی بنا دیا۔ میں آج کل نہایت سنجیدگی سے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق غور اور گذشتہ زندگی پر سختی سے تنقید کر رہا ہوں۔ ازدواجی زندگی کی فکریں اور دقتیں، بندشیں اور ذمہ داریاں گھبرا دیتی ہیں کہ مجھ جیسا بے فکرا شخص پوری ذمہ داری کے ساتھ انھیں اٹھا سکے گا؟ ان کو خوشی سے قبول کرے گا؟ اپنے فرائض خوبی سے انجام دے سکے گا یا نہیں؟ اگر شادی کے چند دن بعد پھر میں اپنی پرانی حالت پر واپس آگیا تو اس معصوم لڑکی کا کیا ہوگا جسے میں اس محبت اور شوق سے بیاہ کر لا رہا ہوں؟ اسی کے ساتھ

ساتھ یہ خوف بھی ہے کہ ممکن ہے نیلوفر میں وہ سب خوبیاں نہ ہوں جن کو میں نے بذات خود فرض کر لیا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک بات میں میری ہم خیال، ہر کام میں میری شریک، ہر بات میں میری ہم نوا ہو۔ چند دن گزر جانے کے بعد ہم میں بھی وہی اختلافات، بدگمانی، بے پروائی اور خود پرستی اپنے نقطہ نظر کو صحیح سمجھنا اور دوسرے کے جذبات کو ٹھکرا دینا، ذرا ذرا سی بات پر بڑے بڑے جھگڑے اٹھا کھڑے کرنا، اور خاندانی جھگڑوں قصوں سے عاجز آ کر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہو جانا غرض وہ سب واقعات جو عام طور پر ہمارے ہاں کی گھریلو زندگی میں تقریباً ہر گھر میں پیش آتے ہیں ہماری زندگی میں بھی تو نہ پیش آئیں گے؟ جاوید جس وقت یہ خیال آتا ہے تو میں سچ مچ کانپ جاتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ شادی وادی کو چھوڑ کر کہیں بھاگ جاؤں۔ مگر نیلوفر کی محبت میرا دامن پکڑ لیتی ہے اور تصویر کا روشن رخ میرے سامنے آ جاتا ہے کہ میرا چھوٹا سا صاف ستھرا خوبصورت گھر ہو گا جسے نیلوفر جیسی دلکش اور دلربا محبوب بیوی اپنے ہاتھ سے سجاتے بناتے گی ۔ اس میں میری اور اپنی آسائش کے سامان مہیا کرے گی۔ اس کا ہنستا ہوا چہرہ میری فکروں اور پریشانیوں کو دور کر دے گا۔ اس کی دلچسپ باتیں مجھے بشاش کر دیا گی اور اس کی محبت میری دنیا میں اجالا کر دے گی اور پھر ——— پھر چند صاف ستھرے پیارے پیارے بچے ہمارے اس چھوٹی سی دنیا کو اور زیادہ محبوب اور دلکش بنا دے گے۔ ہماری محبت اور زیادہ استوار ہو جاتے گی۔

جاوید میرے احساسات کا مذاق نہ اڑاؤ۔ اگر تم میں کچھ بھی دور اندیشی کا مادہ ہے تو یہی حالت تم پر بھی گذر چکی ہو گی اور تم میری حالت کو خوب سمجھ جاؤ گے۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہ کہہ کر میں نے اپنے دل کو مطمئن کرتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے ہمیشہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنی طبیعت کو جس حد تک ممکن ہو گا۔ نیلوفر کی طبیعت کے موافق بنانے کی کوشش کروں گا۔ آخر کیوں ہمیشہ مرد یہ چاہتا ہے کہ عورت ہی اپنی طبیعت کو بدلے اور مرد کوئی جبر اپنی طبیعت پر نہ کرے میں اس سے توقع اتنی زیادہ نہ کروں گا جس کو وہ پورا نہ کر سکے اور خود اس کی کوشش کروں گا کہ اس کی توقعات کو پورا کر دوں۔ کچھ وہ جھکے گی، کچھ میں جھکوں گا، دونوں ایک دوسرے کے مزاج اور عادات کو پہچان کر اپنی طبیعت دوسرے کے موافق بنائیں گے دوسرے سے ایثار و قربانی کی امید کم رکھیں گے اور خود زیادہ کرنے کی خواہش کریں گے، بدگمانیاں پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک دوسرے سے اپنی رنجشیں بیان کر کے صفائی کر لیں گے اور اپنے قصوروں کا فوراً اعتراف کر لیا کریں گے اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبت کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے تو انشاء اللہ ۔۔۔۔۔۔ خدا کرے کہ اس نیلوفر اس معاملے میں میری ہم خیال ہو۔۔۔۔ ہم ہمیشہ خوش و خرم رہیں گے۔ مشکلوں اور پریشانیوں کو ہنس کھیل کر۔۔۔۔۔۔ بیماریوں اور تکلیفوں کو خندہ پیشانی سے۔۔۔۔۔۔ غرض ہر دنیاوی آفت کو اتحاد اور یک جہتی سے برداشت کریں گے تو ہماری زندگی کامیاب ہو گی اور ایک نمونہ شرط یہی ہے کہ آپس کی محبت کو ہمیشہ تازہ رکھیں۔۔۔۔۔۔

غلط فہمیوں سے اسے زنگ آلود نہ ہونے دیں۔

جاوید اب رخصت ہوتا ہے۔ میں اور نیلوفر بے چینی سے تمھارے اور فرحت کے منتظر ہیں۔

نئی امیدوں کے ساتھ نئی دنیا میں قدم رکھنے والا

تمھارا پرویز

ان مٹ نقش

م۔ میری دوست ہم خیال، ہم مذاق اور ہمدرد و صلاح کار ہے وہ
ہمیشہ ہنستی ہوئی اور خوش خرم نظر آیا کرتی ہے۔ بہت باتونی اور ہنس مکھ ہے
وہ اپنے صدموں اور پریشانیوں کو دوستوں اور عزیزوں پر بہت کم ظاہر
کرتی ہے اور اس لئے اس کے سب دوست اسے بے فکر اور خوش باش
سمجھتے ہیں

ایک دن وہ میرے پاس آئی۔ اس وقت اس کا بشاش چہرہ افسردہ سا
نظر آرہا تھا، آنکھوں میں بھی نمی سی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا کیوں۔ کیا
بات ہے۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا" صالحہ میں نے کچھ لکھا ہے
وہ تمھیں دکھانے لائی ہوں"! میں نے اشتیاق سے کہا" لاؤ لاؤ جلد دکھاؤ
وہ بولی" میں ایک دن تنہا بیٹھی اپنی کتاب زندگی کے گذشتہ اوراق الٹ
پلٹ رہی تھی۔ قلم میرے ہاتھ میں تھا بغیر کسی خاص قصد یا ارادے کے یہ مضمون
سا تیار ہو گیا۔ تم جانتی ہو کہ میں کوئی افسانہ نگار نہیں اور نہ یہ کوئی قصہ ہے
یہ چند دردناک۔ تلخ سچے واقعات ہیں جنھوں نے میری زندگی پر بہت گہرا
اثر ڈالا ہے۔ یہ میری بعض گم شدہ اور عزیز ترین ہستیوں کی یاد کے وہ

نقش ہیں جو میرے دل پر کندہ ہیں ـــــــ تم اپنے کو بڑا افسانہ نگار سمجھتی ہو۔ ان کا افسانہ بنا کر اپنی کتاب میں چھپوا دینا"۔ میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیے اور پڑھنے لگی۔ جب تک پڑھتی رہی محو رہی، پڑھ چکی تو میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اف میری اس ہنسوڑ دوست کے دل پر ایسے ایسے جاں گزا صدمے گزر چکے ہیں........ اس کے سینے میں درد فراق کی ایسی پرسوز آگ جلتی رہتی ہے۔ اور ہمیں اندازہ بھی نہیں۔ ہم لوگوں کی ظاہری حالت سے کس قدر غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میری دوست سر جھکائے بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر قالین میں جذب ہو رہے ہیں۔ آخر اس نے اپنے آنسو خشک کئے اور حسب عادت ذرا مسکرا کر کہا "صالحہ مجھے رونا دھونا پسند نہیں ـــــــ تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی لاحاصل چیز ہے۔ اگر رونے سے اپنی کھوئی ہوئی پیاری ہستیوں کی ایک جھلک ہی دیکھنے کو مل سکتی تو میں اپنی ساری زندگی رو رو کر ختم کر دیتی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال ہی تواں بہ تمنا گریستن

مگر میں جانتی ہوں کہ یہ سب بے فائدہ ہے مولا کی رضا پر راضی رہنا چاہئیے پھر بھی کبھی کبھی ضبط نہیں ہوتا۔ آنسو نکل ہی پڑتے ہیں۔ خیر ـــــــ تو یہ بتاؤ اس سے تمہیں کسی افسانے کا پلاٹ مل جائے گا؟" میں نے کہا "پیاری دوست اس میں ایک نہیں کئی افسانوں کا پلاٹ موجود ہے۔ مگر میں اس کا افسانہ

نہیں بناؤں گی۔" اس نے افسردگی سے کہا "کیوں پسند نہیں آیا؟ ہاں سچ ہے میری خوشیوں یا رنج سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو ان کا افسانہ بنایا جائے ٹھیک ہی جو چیز مجھے اس قدر متاثر کرتی ہے وہ کیا ضرور ہے کہ دوسروں کو بھی متاثر کرے۔" میں نے جواب دیا "نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ یہ واقعات تو اس قدر پُردرد ہیں کہ ہر دل پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں..... بھلا ایسا کون ہوگا جس پر اس قسم کا کوئی نہ کوئی صدمہ نہ پڑا ہو۔ پھر کیوں لوگ اس سے متاثر نہ ہوں گے۔ عزیز بہن! سچے جذبات حقیقی واقعات، اصلی غم میں جو لذت جو لطف اور مزا ہے وہ بناوٹ اور نقل میں نہیں۔ اگر میں نے زیب داستان کے لئے ان میں کچھ بڑھا کچھ گھٹا اور کچھ دل سے جوڑ کر فرضی باتیں بھر دیں تو بہت ممکن ہے کہ یہ واقعات زیادہ دلچسپ ہو جائیں۔ مگر پھر اس میں وہ بات نہ رہے گی جو اب ہے۔ اس میں دل کی حالت کی جو حقیقی تصویر اور جذبات کی جو سچی کیفیت بیان کی گئی ہے وہ نقلی زندگی اور فرضی افسانوں میں پیدا نہیں ہو سکتی یہ اپنے اسی رنگ میں میرے بہت سے افسانوں سے بہتر ہے۔" اس نے تعجب سے کہا "کیا سچ مچ اسے اپنے افسانوں کے ساتھ چھپواؤ گی عجیب بات معلوم ہوگی؟" میں نے کہا "ہاں ہاں ضرور چھپوا دوں گی۔ بعض اوقات فرضی قصوں سے زیادہ پُر اثر سچے واقعات ہوتے ہیں۔ آخر قصہ کیا ہے؟ اس میں بھی تو کسی حقیقی زندگی کا تجربہ قصہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جس فرضی تصویر میں اصلی خد و خال نہ ہوں وہ نامکمل اور ناکامیاب ہوگی اور پھر اس میں تو..........." اس نے میری بات پوری نہ ہونے دی

اور اپنی کتاب زندگی کے یہ چند منتشر اوراق میرے ہاتھ میں دے دیئے
"تو لو یہ تمھاری نذر ہیں۔"

ورق میرے ہاتھ میں تھے اور میری نظر اس جگہ جمی ہوئی تھی جہاں
سے وہ غائب ہو گئی تھی۔

اَن مِٹ نقش

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

نہ جانے میری عمر کیا ہے پر اتنا جانتی ہوں کہ میرا کام بس کھانا، کھیلنا یا رو دھو کر ماں کی محبت بھری آغوش میں چھپ جانا ہے اور کسی بات کی مجھے خبر نہیں۔

میں کسی کھیل میں مصروف ہوں اور ہمجولیوں سے جھگڑ رہی ہوں کہ چیخوں کی آواز کان میں آتی ہے ہم سب اپنا اپنا کھیل چھوڑ کر بھاگ کر دالان میں آتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ پھوپی اماں نے ایک تصویر زمین پر ڈال رکھی ہے اور تڑپ تڑپ کر رو رہی ہیں اور کہتی جاتی ہیں کہ ہائے تصویر والے کی چاند سی صورت خاک میں مل گئی۔ اب تصویر کو کیا کروں اور میرے بھائی جان انھیں گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ یہ یاد نہیں کیس

مگر کسی نہ کسی طرح مجھے اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے باپ مر چکے ہیں۔
اور میری پھوپی انھیں یاد کر کے رو رہی ہیں۔ میں نہیں جانتی باپ کسے کہتے
ہیں میں اپنے چچا اور ماں ہی کو سب کچھ سمجھتی ہوں۔ موت کا مفہوم بھی میری
سمجھ میں نہیں آتا لیکن آج اچانک یہ معلوم کر کے کہ میں اس نعمت سے محروم
ہوں جو دوسرے ہمجولیوں کو میسر ہے۔ میرے ننھے سے دل پر پہلی مرتبہ
گہری اور سخت چوٹ لگتی ہے......... میں یتیم ہوں۔ اور ایسی یتیم جس نے
اپنی یاد میں باپ کی صورت تک نہیں دیکھی ..... میں پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگتی ہوں اور میری اچھی اچھی محبت والی اماں اپنے آنسو پونچھ کر
مجھے گود میں اٹھا لیتی ہیں۔ ان کی آغوش میں جا کر مجھے ایسی راحت، ایسا
سکون اور آرام محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی گود میں منہ چھپا کر چپ ہو
جاتی ہوں۔ یہ ان مٹ یاد کا پہلا نقش تھا جو میرے دل پر پڑا۔

میری عمر چودہ پندرہ سال کی ہے مگر بالکل الھڑ اور ناتجربہ کار ہوں
گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہر قسم کی ذمہ داریوں سے
آزاد اور اس لئے دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ہوں۔ لیکن اپنی
پیاری اماں کی بیماری نے کئی مہینے سے مجھے رنجیدہ کر رکھا ہے۔ میرے
علاوہ سارا گھر..... میری بہنیں اور بھائی میرے چچا اور پھوپیاں، میری
خالہ اور ممانی ...... سب میری اماں کی بیماری سے بدحواس اور پریشان
ہیں اور جان توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ان کی انمول جان بچالیں

میں اداس ہوں کیونکہ اب ہیں رات کو نیند نہ آنے کا ڈر لگنے، یا جی گھبرانے کا بہانہ بنا کر ان کے بستر میں جا کر ان کے پہلو میں سو نہیں سکتی. پریشان ہوں کہ ان کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی.......... افسردہ ہوں کہ وہ بیمار ہیں اور کوئی میری طرف توجہ کرنے والا نہیں.......... لیکن. آنے والی ہولناک مصیبت سے بے خبر ہوں. میں اوروں کی طرح مایوس نہیں، اور نہیں جانتی کہ یہ نعمت مجھ سے چھن جانے والی ہے نہ جانے کیوں میں اپنی اماں کو غیر فانی ہستی سمجھتی ہوں.

میں اماں کے پلنگ کے پاس بیٹھی انھیں پنکھا جھل رہی ہوں. دوسری طرف میرے چچا اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہے ہیں. اماں بچشم نم ان کی طرف دیکھ رہی ہیں اور ان کے یہ الفاظ میرے کان میں پڑتے ہیں "اور بچے تو خدا کا شکر ہے سمجھدار اور اپنے قابل ہو گئے ہیں مگر اس کی مجھے بہت فکر ہے. یہ ناسمجھ، ضدی اور لڑاکا ہے. اسے ابھی ماں کی ضرورت تھی. میرے بعد اس کا کیا حال ہوگا"! الفاظ میرے کان میں گونجتے ہیں. اماں کا اشارہ بھی سمجھ جاتی ہوں مگر کوشش کرتی رہتی ہوں کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہ آئے. میں اپنے دل کو فریب دینے کی کوشش کرتی رہتی ہوں....... خدا نہ کرے کہ وہ دن ہو کہ میں ہوں اور میری اماں نہ ہوں

اس سے تیسرا دن ہے میں پیٹ کے درد سے سخت بے قرار ہوں جو اکثر ہوا کرتا ہے. میں دوسرے کمرے میں پڑی رو رہی ہوں. میری منجھلی بہن مجھے روتا دیکھ کر بڑی بہن سے ناراضگی کے لہجے میں کہتی ہیں" اس کو اپنی

ہی پڑی رہتی ہے۔ خدا جانے کب عقل آئے گی"۔ میں ان کے الفاظ کا یہ مطلب
سمجھتی ہوں کہ گھر میں کسی کو میری پروا نہیں۔ میری اماں جو میری تکلیف کا خیال
کرتی تھیں۔ بیمار ہیں یہ سوچ کر اور زیادہ رونا آجاتا ہے ——
سارا دن درد کی شدت میں لڑتی رہتی ہوں۔ شام کو درد کی تکلیف کم ہوتی
ہے تو مجھے اماں کے پاس جانے کی خواہش ہوتی ہے درد کی حالت میں
مجھے ان کے پاس جانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ صحن میں پلنگ بچھا ہوا ہے اور
اس پر اماں لیٹی ہیں۔ میں ان کے پاس جا کر ان پر جھکتی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لے کر کہتی ہوں" اماں جی کیسا ہے"؟ اماں اپنی بڑی بڑی آنکھیں جن میں
صدمہ اور افسوس، محبت اور شفقت لہریں مار رہی ہے کھول کر مجھے دیکھتی ہیں
اور دو آنسو ان کی آنکھوں کے گوشوں سے ادھر ادھر گر پڑتے ہیں۔ نہ جانے
میں کب تک اس حالت میں بیٹھی رہتی ہوں کہ کسی کی آواز آتی ہے پردہ کر لو
ڈاکٹر آ رہے ہیں۔ میں بھاگ کر بیچ کے کمرے میں چلی جاتی ہوں وہاں میری
باجی اور چھوٹی باجی دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے پھوٹ
پھوٹ کر رو رہی ہیں۔ میں بدحواس ان کے پاس جاتی ہوں "باجی
چھوٹی باجی کیا ہوا کیوں رو رہی ہو" مجھے کوئی جواب
نہیں ملتا۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر کے جانے پر ہم لوگ باہر آتے ہیں تو کیا
دیکھتے ہیں کہ چچا ابا منہ پر رومال رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں اور اماں
کا منہ سفید چادر سے ڈھکا ہوا ہے میری دونوں بہنیں اماں کے پلنگ
پر جھک کر چیخیں مارنے لگتی ہیں اور اچانک میرے دل پر جیسے کوئی بڑے

زور سے پتھر کھینچ مارتا ہے اور اس وقت مجھ پر یہ روح فرسا، یہ جانگزا حقیقت
واضح ہوتی ہے کہ اماں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور مجھے اس دنیا میں
تنہا چھوڑ گئیں .... میں بے خودی کی حالت میں اپنی اماں کے متبرک
پیارے ...... مگر ہائے ...... بے جان جسم پر جھک جاتی ہوں اور بے
اختیار چیخیں نکل جاتی ہیں۔ ...... روتے جا رہی ہوں ...... برابر
.... بے خبر .... مدہوش۔

ابدی آرام گاہ میں آرام کرنے کی خاطر میری اماں کو وطن میں لایا
جاتا ہے۔ راستہ کیسے کٹا، رات کیوں کر گزری، گھر میں کیا کیا ہوا، مجھے
اس میں سے کسی بات کی خبر نہیں میں تو بس رو رہی ہوں۔ ..... برابر ..... مسلسل
صبح کو میری ہمجولیاں روتی ہوئی مجھے پکڑ کر دوسرے گھر میں لے جاتی ہیں۔ وہاں
میں کیا دیکھتی ہوں کہ ایک عجیب سے پلنگ پر میری پیاری اماں، نہائی دھوئی
سفید پاکیزہ لباس میں ملبوس لیٹی ہیں۔ سارا جسم ڈھکا ہوا ہے صرف ان کا دلکش
دلآویز، محبت بھرا چہرہ کھلا ہوا ہے جس سے طمانیت قلبی ظاہر ہو رہی ہے۔ ان
کی آنکھیں نیم وا ہیں، ہونٹ بند، اور گردن ایک طرف کو قدرے کج ہے
کھلے بال چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے ہیں اور وہ دنیا سے اپنے لاڈلے بیٹوں
اور کم نصیب بیٹیوں سے، عزیزوں رشتہ داروں سے، گھر بار سے ....
سب سے بے خبر میٹھی نیند کے مزے لے رہی ہیں گھر میں جو قیامت بپا ہے
اس کا انھیں کوئی احساس نہیں ...... کوئی خبر نہیں ..... میرے بڑے بھائی
کا روتے روتے منہ سوج گیا، چھوٹے بھائی کی فلک شگاف چیخیں دلوں کو ٹکڑے

ٹکڑے کر رہی ہیں، میں اپنی بہنوں کے برابر اماں کے پلنگ کے پاس گر پڑتی
ہوں ۔ پلنگ اٹھا لیا جاتا ہے سب پیچھے پیچھے اپنی محبوب ہستی کو آخری
مرتبہ رخصت کرنے کے لئے آخری دروازے تک جاتے ہیں۔ دروازے کی
چوکھٹ سے دو تین عورتیں مجھے پیچھے کھینچ لیتی ہیں اور زبردستی پکڑ کر اندر لے
جاتی ہیں اور ہم سب بہنیں روتے روتے نیم جان آکر تخت پر گر پڑتے ہیں۔
پرسے کے لیے سارا شہر امنڈ آیا ہے۔ کیا اپنے کیا غیر، کیا دوست کیا دشمن
کیا مرد کیا عورتیں سب انھیں یاد کرکے، ان کی خوبیوں کا بیان کرکے رو رہے
ہیں۔ ایک ایک عورت ہمیں گلے سے لگاتی۔ اماں کا ذکر کرتی اور ہچکیاں لیتی
ہے۔ مگر مجھے سوا اس حس کے کوئی حس باقی نہیں کہ اماں میری اماں
ہمیشہ کو مجھ سے جدا ہو گئیں اور اب میں بے ماں کی ہوں ۔ کوئی نہیں
جس سے میں اپنا دکھ کہہ سکوں گی ۔ کوئی نہیں جو مجھے جھڑک کر پھر پیار
کرے گا۔ کوئی نہیں جس سے یہ امید ہوگی کہ قصوروں، برائیوں، ضدوں اور
حماقتوں کے باوجود اس کی محبت کم نہیں ہوگی۔ جس کی ڈانٹ اوروں کے
ہزاروں لاڈ سے بڑھ کر تھی، جو میرے دل کی بات سنتی اور سمجھتی تھیں
جو میری ضد اٹھاتی ۔ ناز سہتیں اور پیار کرتی تھیں۔ جن پر میرا زور میرا حق
تھا۔ وہ محبت و شفقت کی مورت، پیار و الفت کی دیوی، اپنوں، غیروں
دشمنوں دوستوں سب سے سلوک اور محبت کرنے والی چل بسیں، بہت سے
بے ماں کے بچوں کو دوبارہ بے ماں کا کر گئیں، بہت سی بیوہ اور محتاج
عورتوں کو بے سہارا کر گئیں، بہت سی محبت کے بھوکے اور ٹوٹے دلوں

کو جوڑنے والی چل بسیں خود ان کی اولاد ان کی محبت سے محروم ہو گئی۔

اس قسم کے سینکڑوں خیالات غیر مربوط طور پر میرے دماغ میں گونج رہے ہیں اور میں گاؤ تکیئے میں منہ دیئے بے دم سی پڑی ہوں کہ کان میں آواز آتی ہے "مرد آرہے ہیں" میرے بھائی اور چچا، نانا اور ماموں اور دوسرے بہت سے عزیز ہماری سب سے پیاری۔ سب سے عزیز سب سے قیمتی ہستی کو ہزاروں من مٹی کے نیچے سلا کر ہمیں تسلی دینے آرہے ہیں!! تسلی!!!

میں ننگے پاؤں ننگے سر جا کر اپنے چچا کے گلے سے لپٹ جاتی ہوں اور بے اختیار پوچھتی ہوں "چچا ابا میری اماں کہاں" وہ مجھے پیار سے گلے لگا کر اور جوش رقت کو روک کر بمشکل اتنا کہہ پاتے ہیں "بیٹی جہاں ابا گئے تھے وہیں اماں بھی گئیں" میرے بھائی جان ہم دونوں بہنوں کو گلے سے لگا لیتے ہیں اور ہم سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں کہ پیچھے سے کوئی ہم دونوں بہنوں سے کہتا ہے "بیٹی بھائیوں کا خیال کرو۔ مرد کا دل کمزور ہوتا ہے۔ دیکھو ان کے دل پر برا اثر پڑے گا۔۔۔۔۔ صبر کرو۔ اللہ صبر کرنے والوں سے خوش ہوتا ہے" میں اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیتی ہوں اور پوری قوت سے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ دیتی ہوں اور بھائی جان کے سینے سے لگی سسکتی رہتی ہوں۔

یہ دوسری وہ نہ بھولنے والی یاد ہے جو آج پندرہ سولہ برس بعد بھی میرے لوح دل پر اسی طرح کندہ ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ

کل کا واقعہ ہے۔ اس طویل عرصے میں میں نے ہزاروں مرتبہ اس پیاری ہستی کو خواب میں دیکھا۔ ہر پریشانی، ہر بیماری، ہر مصیبت اور ہر صدمہ سے پہلے یا بعد۔ یہ روحوں کا وہ گہرا اور سمجھ میں نہ آنے والا تعلق ہے جسے ہم صرف وجدان سے محسوس کر سکتے ہیں عقل سے نہیں سمجھ سکتے۔

اماں کے انتقال کے بعد سب عزیزوں کی محبت مجھ سے بڑھ گئی مگر ان کی عنایتوں اور محبتوں کے باوجود مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ میں اس وسیع و عریض دنیا میں تنہا ہوں۔ اکیلی۔

ان جیسا دوست، جس پر میں اپنا زور اور حق سمجھتی تھی مجھے نہیں ملا۔ وہ دو چار قصوروں کی سزا دیتی تھیں تو دس کو معاف بھی کر دیتی تھیں۔ مگر ان کی سرزنش اور سزاؤں میں جو لذت۔ جو اپنائیت۔ جو بے پایاں لطف تھا وہ دوسروں کی عنایت اور محبت میں نہیں۔

ماں۔۔۔ اے ماں۔۔۔۔ تو دنیا کی سب سے بڑی سب سے بیش بہا نعمت سب سے پیاری ہستی ہے جس کا بدل نہیں ہو سکتا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ماں۔۔۔۔ تیری عزیز یاد بھی تجھ سے کچھ کم قیمتی شے نہیں۔۔۔۔

میری نوجوان بہن جو اماں کو سب سے زیادہ چاہتی تھیں جنھوں نے ان کی آٹھ دس مہینے دن رات ان تھک خدمت کی تھی، جو راتوں کو اماں کے پلنگ کے گرد پھر کر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ خدایا ان کی بیماری مجھے ہو جائے اور یہ اچھی ہو جائیں، جو ماں کی سچی عاشق زار تھیں۔۔۔۔ ان کے دل پر ایسی

ماں کی جدائی سے کیا گزری ہوگی؟ ان کی حالت دیکھ کر سب کی رائے تھی کہ
جلد سے جلد ان کی شادی کر دی جائے تاکہ وہ دوسرے دھندوں میں لگ
کر اس صدمہ کو بھلا سکیں، نسبت اماں کر ہی گئی تھیں۔ ان کی شادی کی تیاریاں
زور شور سے ہونے لگیں لیکن وہ خود ماں کے غم میں اندر ہی اندر گھلتی رہیں
اور ٹھیک اس زمانے میں جب شادی کی تاریخ مقرر کرنے کی بات چیت ہو رہی
تھی، سخت بیمار ہو گئیں۔ .... بیماری بڑھتی گئی ...... دہلی لاکر بہتر سے
بہتر علاج کرانے کی کوشش کی گئی ...... آخر ایک دن ڈاکٹروں کے یہ
اطمینان بخش الفاظ کان میں پڑے کہ اب یہ اچھی ہیں۔ کمزوری باقی ہے کسی پہاڑ
پر بھیج دیا جائے۔ مہینے دو مہینے میں بالکل تندرست ہو جائیں گی۔ بھائی
جان کی چھٹیوں میں کچھ دن باقی تھے بڑی باجی اپنے گھر تھیں۔ ایک عزیز
کے ہاں پہاڑ پر ہم تینوں بہن بھائی میری بہن، چھوٹے بھائی اور میں۔
روانہ کر دیئے گئے۔ اور طے پایا کہ پہاڑ سے واپسی پر شادی کر دی جائیگی

ہم تینوں پہاڑ پر بھائی جان کی آمد کے دن گن رہے تھے۔ چھوٹی
باجی کی صحت بظاہر بالکل اچھی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلکنے
لگی تھی ....

جون کی سات یا آٹھ تاریخ تھی۔۔ دو دن بعد بھائی جان کے پہنچنے
کی توقع سے ہم بہت خوش تھے۔ چھوٹی باجی جو بھائی پر پروانہ وار نثار
تھیں حد سے زیادہ بے قراری سے ان کی آمد کا انتظار کر رہی تھیں۔....
اس دن انھوں نے اپنی بہنوں اور سہیلیوں اور بھائی کو خط لکھے۔....

آہ ان کے وہ پیارے خط۔۔۔۔ جن میں خوبصورت الفاظ سڈول موتیوں کی طرح جڑے ہوتے تھے اور جن کے خوشنما جملے موتیوں کی مربوط لڑیاں معلوم ہوتے تھے۔

۹ جون گزر چکی۔ رات کے آٹھ بجے کا وقت ہے۔ میں بیچ کے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ کیا دیکھتی ہوں کہ دوسرے کمرے سے چھوٹی باجی تڑپتی ہوئی آ کر برامدے کے پلنگ پر گر جاتی ہیں۔ سب ان کی طرف دوڑتے ہیں معالج ڈاکٹر کو بلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ آہ مجھے اب بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ لوگوں پر مایوسی کا اظہار کر دیتی ہے۔۔۔۔۔ دو تین گھنٹے ان کی بے قراری اور تڑپ جاری رہتی ہے اور آدھی رات سے بظاہر سکون ہو جاتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر ان کے سرہانے بیٹھی بڑی محبت اور افسوس کی نظروں سے انھیں دیکھ رہی ہے چھوٹے بھائی اور دوسرے رشتے کے بھائی اور ماموں (جن کے ہاں ہم ٹھیرے ہوئے ہیں) بار بار آ کر انھیں دیکھ جاتے ہیں اور سب بے چین بے قرار پھر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ میں بہن کی پٹی سے لگی بیٹھی ہوں اور ان کے چاند سے چمکتے ہوئے چہرے اور بند آنکھوں کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔۔ ڈاکٹرنی کا ہاتھ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی نبض پر جاتا ہے اور ہر بار وہ مجھ سے کہتی ہے "بی بی اپنی سسٹر کو پکارو تو" میں ہر بار پکارتی ہوں "چھوٹی باجی چھوٹی باجی۔۔۔۔" اور ان کی وہ کنول کی سی حسین آنکھیں آہستہ آہستہ کھلتی ہیں جن میں مجھے بہن کی لازوال محبت، ماں کا کھویا ہوا پیار، اور ساتھ ہی نہ پوری ہونے والی آرزوئیں، ناکام

تمنائیں... کسی کی دید کا اشتیاق ..... حسرت اور افسوس جھانکتا ہوا نظر آتا ہے
. میرا دل بے طرح دھڑکتا ہے اور بعض وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ
چلتے چلتے یا تو پھٹ سے بند ہو جائے گا. یا منہ کے رستے باہر نکل پڑے گا -
جب ڈاکٹرنی ان کی ناک کے آگے بار بار ہاتھ رکھ کر سانس کو دیکھتی ہے تو میرے
دل پر زور سے دھکا لگتا ہے. یہ کیوں اس طرح دیکھ رہی ہے ؟ کیا ہونے
والا ہے ؟ کس سے پوچھوں...... میرے پاس کوئی نہیں......

چار بج گئے صبح صادق کا وقت ہے، پہاڑوں کی چوٹیاں صبح کے
کے ہلکے دھندلکے میں ذرا ذرا نمایاں ہونے لگی ہے میں ایک بار پھر
اپنی بہن کو پکارتی ہوں "چھوٹی باجی" وہ محبت بھری آنکھیں بڑی مشکل سے
تھوڑی سی کھلتی ہیں..... میں بے قرار ہو کر کہتی ہوں" باجی تم بولتی کیوں
نہیں "! ان کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں. وہ آہستہ آہستہ بند ہو جاتی
ہیں... اور ان کے گوشوں سے آنسوؤں کے شفاف قطرے ادھر ادھر
ڈھلک جاتے ہیں...... میں وحشت کے عالم میں وہاں سے اٹھ کر کھڑکی
کے پاس جا کھڑی ہوتی ہوں. صبح صادق کا نظارہ میرے سامنے ہے
یکایک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کیا باجی بھی مجھے چھوڑ کر جا رہی
ہیں یہ ڈاکٹر کیوں چپ چاپ بیٹھی ہے کیوں کچھ تدبیر نہیں کرتی
ہائے یہ کیا ہو رہا ہے...... کیا ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہو جائے گا
میں گھبرا کر ان کے پلنگ کے پاس جا کر ان پر جھکتی ہوں. وہ سوتی معلوم ہوتی
ہیں نفس کی آمد و شد جاری ہے. ماموں مجھے اور میرے بھائی کو زبردستی

برامدے کے دوسرے حصے میں یہ کہہ کر لٹا دیتے ہیں کہ ذرا دیر آرام کر لو۔ وہ تو اب سو رہی ہیں۔ انھیں پریشان نہ کرو۔" ہم دونوں کم عمر، ناتجربہ کار بہن بھائی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ ہماری ہمیشہ کو بچھڑنے والی بہن کے آخری دیدار سے محروم کر رہے ہیں۔ دونوں ایک پلنگ پر ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر سسکنے لگتے ہیں۔ شاید چند منٹ کو آنکھ جھپکی ہوگی کہ میرے کان میں اپنے بھائی کی دلفگار چیخ کی آواز پڑی اور میں بھاگ کر وہاں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے بھائی اپنی پیاری بہن کے پلنگ کی پٹی سے سر پھوڑ رہے ہیں اور ڈاکٹرنی باجی کی خوبصورت، دلکش پیاری آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آہ دس جون کی وہ منحوس رات کیا میں بھول سکتی ہوں جب شملے پر میں نے اپنی عزیز ترین بہن کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔۔۔۔۔ وہ بہن جس کی صفات اور خوبیاں ہر ایک کا دل موہ لیتی تھیں، جو حسن صورت اور سیرت دونوں میں لاجواب تھی، جو مجھے ماں کے بعد ماں کی طرح پیاری۔ سب سے زیادہ عزیز، غم خوار و غم گسار۔۔۔ نوجوان اور حسین ۔۔۔۔۔۔ عنقریب ہونے والی دلہن تھی!! میرا دل سینے کے اندر گھائل طائر کی طرح تڑپ رہا ہے۔ میں روتے روتے اپنی جان دے دینا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ مگر آہ یہ دل! یہ پتھر دل۔۔۔ انسان کے اعضاء کا سب سے نازک، سب سے زیادہ حساس اور پھر سب سے زیادہ سخت۔۔۔۔۔۔ سب کچھ سہہ جانے والا دل۔۔۔۔ کسی طرح پھٹ نہیں چکتا۔۔۔۔ آہ اس کی منحوس حرکت بند کیوں نہیں ہو جاتی۔۔۔۔

باجی کو لے کر ہم سب وطن روانہ ہو رہے ہیں۔ ایک موٹر پر میری پیاری بہن کا تابوت رکھا ہے اور دو عزیز وہاں بیٹھے ہیں۔ دوسری پر میں اور میرے بھائی نہیں معلوم کس طرح چودہ پندرہ گھنٹے کا یہ مصیبت ناک سفر طے ہوتا ہے میں نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔ لیکن جب کبھی وہ موٹر نظر پڑ جاتی ہے تو دل میں عجیب ہوک سی اٹھتی ہے۔ میں برقعے میں منہ چھپا لیتی ہوں اور دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگتی رہتی ہوں خدایا یہ خواب ہو خواب اور جب میری آنکھ کھلے تو ....

رات کے بارہ بجے ہم وطن پہنچتے ہیں۔ باجی کے استقبال کی شاندار تیاریاں ہیں۔ دوست اور عزیز۔ جاننے والے اور انجان سب ان کی پیشوائی کو موجود ہے .... بازاروں میں لوگ اپنی اپنی دکانوں پر کھڑے افسوس سے ہاتھ مل رہے ہیں۔

اور آہ میرے بھائی جان جو بہن کے پاس انھیں صحت ور، تندرست سرخ و سفید دیکھنے کی آرزو میں پہاڑ کی طرف روانہ ہو چکے تھے جن کے پاس آج ہی بہن کا پیارا خط پہنچ چکا تھا جس میں جلد آنے کی تاکید تھی دہلی اسٹیشن پر دوستوں کی زبانی یہ خبر روح فرسا۔ جانکاہ خبر سنتے ہیں وہ ہستی جسے وہ دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے ان کی عاشق زار بہن اس دنیا سے چل بسی!! ان کے دل پر کیا بیتی ہے کو وہ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے پہنچنے سے چند گھنٹے پہلے وہ بہن کے ہونے والے دولھا کے ساتھ وطن پہنچتے ہیں۔ وہ کس دل سے بہن کو خواب

ابدی کی حالت میں دیکھتے ہیں......کون جانے -!!

ایک بار پھر - نو مہینے کے وقفے کے بعد - اسی دالان میں، اسی قسم کے پلنگ پر میں اپنی ایک اور عزیز اور پیاری ہستی کو سوتا ہوا پاتی ہوں - فرق اس قدر ہے کہ اس پُر ارمان نے ابھی زندگی کی صرف اکیس بائیس بہاریں ہی دیکھی ہیں، ایسے لوگ نا شاد و نامراد اور جوانا مرگ کہتے ہیں.... پلنگ پر حسن و جوانی کا یہ دلربا نمونہ مرمریں مجسمہ کی طرح ساکت و صامت پڑا ہے - چاند سے چہرے پر زندگی کی چمک کے بجائے ایسا روحانی جلوہ ہے جسے دیکھ کر حوران بہشتی شرما جائیں، لبوں پر ایسا تبسم ہے - جس سے طمانیت قلبی اور ابدی سکون مترشح ہو رہا ہے - لمبے لمبے بھورے بال چاند کے گرد ہالہ کئے ہیں یہ نظارہ میری قوت برداشت سے باہر ہے میں پلنگ پر گر جاتی ہوں اور چلاتی ہوں "باجی - چھوٹی باجی میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی.... ہائے اکیلا نہ چھوڑ دیں تمھارے اور اماں کے بغیر اس دنیا میں نہیں رہ سکتی.... مجھے بھی ساتھ لے لو.... ہائے باجی "میری ایک بہن کہتی ہیں" دیکھو دونوں بھائی کس قدر تڑپ رہے ہیں - زرا ان کا خیال کر کے صبر کرنے کی کوشش کرو میں اپنے بھائیوں کو دیکھتی ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے - ضبط کا کیا ذکر اور زیادہ بے قرار ہو جاتی ہوں - مگر اسی وقت کیا دیکھتی ہوں کہ لوگ پلنگ اٹھا رہے ہیں - آہ اب یہ پیاری صورت، یہ جان سے کہیں زیادہ عزیز ہستی - اب کہیں نظر نہ آئے گی؟ میں تو ان کی شادی کے تصور سے کانپ جاتی تھی - اب یہ ابدی جدائی کیسے سہی جائے گی..... خدایا کیا ہوگا؟ کیا کروں؟ میں

پردے سے، اپنے وجود سے، اپنی زندگی سے بیزار رہتی ہوں کہ جہاں تک ہو سکے اپنی بہن کے ساتھ ساتھ جاؤں۔ کم سے کم آخری آرام گاہ تک تو ساتھ دوں۔ مگر رواج اور خاندانی روایات کی بندشیں اور آہ۔ عورت کی بےبسی مجھے اپنے ارادے کی تکمیل نہیں کرنے دیتی۔ گلی کے سرے سے چند زبردست مگر با محبت ہاتھ مجھے زبردستی کھینچ کر اندر لے جاتے ہیں اور میری یہ آرزو سختی سے کچل دی جاتی ہے کہ میں اور چند قدم ہمیشہ کو بچھڑنے والی بہن کے ساتھ جا سکوں۔

زمانے کی گردش سے اس واقعے کو چودہ سال کا عرصہ گزر گیا۔ دنیا میں اور خود میری زندگی میں بہت سے انقلابات ہوئے مگر کیا میں ۱۰ ؍جون ۲۹ء اور یکم محرم الحرام کی وہ ہولناک رات، وہ سیاہ دن بھول سکی جس نے مجھ سے ایسی اچھی ایسی پیاری بہن کو چھین لیا۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر، اور اکثر راتوں کی تنہائیوں اور دن کے سناٹے میں۔ ان کی زندگی۔ ان کی باتیں۔ ان کی سیرت۔ اور پھر ان کی جوان اور اچانک موت۔ وہ یادگار دن اور رات۔ اور اس کے سارے واقعات۔ ایک ایک کر کے سینما کی تصویروں کی طرح میرے دماغ کے پردے پر ابھرتے ہیں اور دل میں میٹھا میٹھا درد، ہلکی ہلکی کسک، دبی دبی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ۔ صرف ایک مرتبہ۔ میں اپنی بہن سے۔ اس دنیا میں اور مل سکتی۔ صرف ایک مرتبہ۔ آہ ناکام تمنائیں۔!!

لیکن میرا عقیدہ، میرا مذہب، میرا ایمان ہے کہ اس زندگی میں نہ

سہی پردوسری زندگی میں ان سے ملوں گی۔ . . . ضرور۔

ڈاکٹر اور تیمار دار اپنا پورا زور لگا رہے ہے کہ کسی طرح موت کے منہ سے مجھے نکال لیں۔ مگر میں خود دنیا سے، تکلیفوں، صدموں اور پریشانیوں سے، اپنے پیاروں سے اور خود اپنے وجود سے بے خبر، بے ہوشی کا لطف اٹھا رہی ہوں۔ دو ہفتے کی جان توڑ کوششوں کے بعد ڈاکٹروں کی یہ رائے ہوئی ہے کہ انھوں نے موت کے منہ سے اس کا تنکا چھین لیا۔ میں نیم بے ہوشی کی تکلیف میں ناقابل بیان تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ بہت آہستہ آہستہ میرے دماغ پر کچھ نقوش ابھرتے ہیں اور میں بار بار "اماں اماں" پکارتی ہوں۔ میری بہن مجھے جواب دیتی ہیں لیکن اس حالت میں بھی میں ان کی آواز پہچان جاتی ہوں اور کہتی ہوں" آپ تو باجی ہیں۔ اماں کہاں ہیں۔ اماں کو بلائیے" اور پھر بے خبر ہو جاتی ہوں۔ خدا جانے پھر کب ہوش میں آئی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں کچھ بیمار ہوں۔ پوچھتی ہوں مجھے کیا ہو گیا؟ جواب ملتا ہے کچھ نہیں اچھی ہو۔ بچہ ہوا ہے میرا دماغ گذشتہ واقعات تقریباً سب سے بھلا چکا ہے میں تعجب سے پوچھتی ہوں" اچھا؟ تو میری شادی ہو چکی ہے" جواب میں میرے شوہر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیتے ہیں۔

بیماری موجود ہے اور شدید تکلیف دہ لیکن دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں اپنے آس پاس، ادھر ادھر دیکھتی ہوں کہ کہیں مجھے بچہ نظر

پڑے۔ مگر ناکام رہتی ہوں۔ فطری شرم اور یہی حیا مجھے دوسروں سے پوچھنے نہیں دیتی لیکن دلی بے قراری سے مجبور ہو کر ایک دن جھجکتے جھجکتے اپنے شوہر سے پوچھ لیتی ہوں بچہ کیا ہوا؟ جواب ملتا ہے "تم بیمار تھیں اس لئے اسے وطن بھیج دیا ہے۔ ایک عورت اسے وہاں دودھ پلاتی ہے"۔

طبیعت بہتر ہو رہی ہے میں چاہتی ہوں کہ مجھ سے سب لوگ میری بہنیں بھاوجیں چچی، خالہ، میری دوستیں اور سہیلیاں، میرے شوہر غرض جو بھی میرے پاس آئیں وہ مجھ سے بچے کا کچھ ذکر کریں۔ مگر کوئی اس کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہتا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وہم آتے ہیں۔ اگر اپنے شوہر سے پوچھتی ہوں تو وہ کچھ ایسے بند بند جواب دیتے ہیں کہ اور زیادہ وسواس پیدا ہوتے ہیں۔

بیماری دوبارہ بڑھ جاتی ہے اور مجھے علاج کے لئے ایک بڑے شہر میں لایا جاتا ہے۔ میرے دل میں وسواس پیدا ہو چکا تھا مگر امید کی ایک کرن اب بھی چمک رہی تھی کہ شاید بچہ وطن میں پل رہا ہو۔ لیکن حالت بیماری میں ایک دن مجھے کسی سے یہ تلخ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کہ یہ سب دھوکا دل بہلاوا تھا۔ بچہ تو پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔

میں اُس الفت سے واقف تھی جو اولاد کو ماں باپ سے ہوتی ہے، اسی سے بھی جو دوستوں اور سہیلیوں میں، بزرگوں اور خوردوں میں۔ بیوی اور شوہر میں ہوتی ہے۔ ان غموں کو بھی جانتی تھی جو ان

کی جدائی سے سہنے پڑتے ہیں۔ لیکن - ماتا - بچے کی محبت - میرے لئے نئی چیز ہے۔ میں اب تک اس سے بے خبر تھی کہ ماں کی محبت کیا ہے۔!! لیکن اب اپنے دل میں ایک ایسا درد، ایک ایسی کسک، ایسی لرزش محسوس کر رہی ہوں جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی - اب مجھے پتہ چلتا ہے کہ ماں کی محبت خدا نے کیا بری چیز بنائی ہے اور بچہ کی موت کا داغ . . . خواہ وہ ایک دن کا بچہ ہو جسے ماں نے دیکھا تک نہ ہو - ماں کے دل پر عمر بھر رہتا ہے۔

اس واقعہ کو دس برس گزر گئے ہیں میں نے بے تکلف ترین دوستوں تک سے اپنے غم پنہاں کا کبھی چرچا نہیں کیا۔ لیکن ان دس برس میں کتنی راتیں ایسی گزری جس میں میں نے اپنی اکلوتی بچی کی یاد میں لاتعداد آنسو بہائے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہوا جب وہ بن کھلی کلی، وہ ان دیکھی ننھی سی جان مجھے یاد نہ آتی ہو . . . . . . اس کی خیالی شکل . . . . . جو بہت دلکش ہے۔ میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے مجھے جب اس کی یاد آتی ہے اور جب اس کا تصور بندھتا ہے تو دل میں ایک ایسی ہوک اٹھتی ہے۔ جس کے درد سے کوئی دوسرا واقف نہیں ہو سکتا۔ ہاں صرف وہ ماں جس کو قسمت نے صرف ایک ہی بچہ دیا ہو۔ اور وہ فوراً چھین بھی لیا ہو !!!

چار دن سے چچا ابا میرے ہاں آئے ہوئے ہیں اور میں ہمہ تن اس کوشش میں ہوں کہ میرے پیارے چچا ابا کو کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ یہاں سے خوش و خرم جائیں۔

وہ روانگی کے لئے تیار ہیں موٹر دروازے پر موجود ہے کہ یکایک
وہ کمرے سے لڑکھڑاتے ہوئے نکلتے ہیں اور مجھے پکارتے ہیں "جلد آ یہاں آ کر
مجھے سہارا دے"۔ میں دوڑ کر ان کے پاس جاتی ہوں اور بڑی مشکل سے انھیں
بیٹھک تک پہنچا دیتی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ گھنٹے بھر کے اندر اندر ہی معلوم ہو جاتا
ہے کہ انھیں فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ بزرگوں میں سب سے عزیز، سب سے
زیادہ شفیق اور ہمدرد، حد سے زیادہ چاہنے والی۔ بیماری میں تیماردار
مصیبت کی ساتھی، پریشانی میں مشیر، برائی کو ٹوکنے اور نازیبا بات پر نصیحت
کرنے والی ہستی۔ چچا ابا کی ہے۔ ان کی بیماری سے دل پر جو بھی گزرتی ہے
سہتی ہوں۔ اب موقع کی نزاکت اور فرض کو سمجھنے لگی ہوں ۔۔۔۔۔ تین دن
اور تین رات اپنے بھائی اور شوہر کے ساتھ مسلسل تیمارداری میں کاٹتی ہوں
ایک منٹ کو اگر کسی ضرورت سے پاس سے ہٹ جاتی ہوں تو وہ بے چین ہو
جاتے ہیں اور پکارتے ہیں میں جلدی سے پھر ان کے پاس آ بیٹھتی ہوں
تیسرے دن وطن سے چچی اور بہنیں اور دوسرے عزیز آ جاتے ہیں اور چچا ابا کو
شہر کے بڑے اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اسپتال میں صرف دو آدمی
رہ سکتے ہیں لیکن سارے دن لوگ باری باری سے آتے جاتے رہتے ہیں
چودہ دن ۔۔۔۔ سینکڑوں آدمی عزیز، غیر، دوست سب امید و بیم
میں ہر وقت دست بدعا رہتے ہیں۔ اس شدید تکلیف کی حالت میں بھی
ہمت و استقلال، صبر اور برداشت، الفت و محبت کا یہ بے نظیر نمونہ اسی
خندہ پیشانی، اسی پیار اور اسی دلسوزی سے ہر ایک سے پیش آتے ہیں۔

جو ان کی سیرت کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ ہر ایک کے دکھ درد کا خیال، ہر ایک کی تکلیف اور راحت کی فکر ہے۔ جو آتا ہے اسے پیار کرتے ہیں، گلے لگاتے ہیں، اس کی اور اس کے عزیزوں کی خیریت پوچھتے ہیں نیک مشورے دیتے ہیں۔ قوم کی فکر بھی لگی ہوئی ہے۔ لڑکوں سے جنگ کی خبریں، مسلم لیگ اور کانگرس کے تعلقات وغیرہ کی بابت دریافت کرتے رہتے ہیں بے ہوشی میں بار ہا ان کے منہ سے سنا گیا "خدایا میرے ملک اور قوم پر رحم کر" نرسوں کا شکریہ ادا کرتے کرتے نہیں تھکتے۔ ڈاکٹروں سے ہنس کر بات کرتے ہیں۔

بیمار پڑتے ہی انھیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اب میں دوسری دنیا میں جا رہا ہوں۔ مگر اس خیال سے خوف وہراس اور پریشانی نہیں۔ جو آتا ہے اسے اپنا پسندیدہ شعر سناتے ہیں ؎

دو روز ز حذر کردن از مرگ روا نیست	روزے کہ قضا آمد و روزے کہ قضا نیست

(اس طرح کہ آنکھوں میں عزیزوں کی جدائی کے خیال سے آنسو ہیں اور لبوں پر راحت ابدی کے تصور سے طمانیت آمیز مسکراہٹ۔)

چودھویں دن فالج کا دوسرا حملہ ہوتا ہے۔ زبان سے پورے الفاظ جملے نہیں نکلتے، آنکھیں اچھی طرح نہیں کھلتیں، دماغ پوری طرح کام نہیں کرتا، حلق سے کچھ نہیں اترتا۔ تکلیف انتہائی حد پر ہے لیکن صبر و استقلال کا یہ حال ہے کہ نہ لب پر شکایت ہے نہ زبان پر آہ۔ اب بھی جب کسی کی آواز کان میں جاتی ہے تو نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں

ں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے سینے پر رکھ لیتے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو
رنے لگتے ہیں اور وہ مندرجہ بالا شعر لڑکھڑاتی آواز سے پڑھتے ہیں۔

آہ، پندرہ دن کی بیماری کے بعد باوجود انتہائی علاج، دوا اور تیمارداری
کے وہ لاثانی ہستی، متعدد صفات کا بے نظیر مجموعہ، خاندان کا سرپرست یتیموں
کا باپ، غم زدوں کا ساتھی، مصیبت میں دشمن تک کے کام آنے والا، بچوں کا
عاشق ــ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے منہ موڑ گیا۔

سارے گھر میں قیامت برپا ہے، میری چچی نہایت صابر ہونے کے باوجود
ڑپ رہی ہیں۔ پھوپی کی حالت ناقابل بیان ہے اور دوسرے عزیزوں کے رونے
ے سارا گھر گونج رہا ہے اور میری تینوں چچازاد بہنیں، جو اب تک خاندان میں
سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھی جاتی تھیں، یتیمی کی مصیبت اور ایسے شفیق
باپ کی جدائی کے غم میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ میرا دل اندر سے
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ جس نے باپ سے زیادہ چاہا۔ ماں سے زیادہ محبت کی وہ
اب ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ساری دنیا خالی خالی، ویران ویران معلوم
ہو رہی ہے۔ چیخیں حلق تک آتی ہیں اور پھنس جاتی ہیں۔ مجھے اپنے فرض کا
احساس ہوتا ہے، میں اپنی حالت کو سنبھالتی ہوں اور اپنی بہنوں کو جن پر
تازہ مصیبت پڑی ہے گلے سے لگا کر تسلی دیتی ہوں، سمجھانے کی ناکام کوشش
کرتی ہوں لیکن آخر میں خود بھی ان کے ساتھ بے اختیار ہو جاتی ہوں۔

آہ! آخری آرام گاہ کو تشریف لے جاتے وقت وہ ان کا نورانی اور پاکیزہ چہرہ،
جس سے اب بھی شفقت اور پیار ٹپک رہا تھا، سینکڑوں عورتیں اندر، ہزاروں

مرد یا ہر اعزیز اور مخالف سب ایک ایک آنکھ لاکھ لاکھ آنسو رو رہے ہیں کہ ایسا آدمی
پیدا ہونا مشکل ہے۔ ہزاروں غریب مصیبت زدہ محلے، پڑوس کی عورتیں آئی ہیں
اور اس طرح رو رہی ہیں کہ جیسے سگی بہنیں یا بیٹیاں ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان کی
سخاوت اور ہمدردی، محبت اور دلسوزی میں اپنے اور غیر، امیر اور غریب، چھوٹے
اور بڑے کی تخصیص نہیں تھی، پلنگ کے آس پاس سب بھانجے بھانجیاں، بھتیجے بھتیجیاں
جمع ہیں اور ہر ایک کی زبان پر یہ کلمہ ہے۔ "ہائے آپ تو ہمارے باپ تھے آپ
دوبارہ کیوں یتیم کر گئے۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ جب کبھی میں اماں کا ذکر کرتی تو تم
پیارے چچا ابا کس پیار سے کہا کرتے تھے "تیری اماں تو میں ہوں" میرے دل
کی گہرائیوں سے یہ چیخیں بلند ہو رہی ہیں "چچا ابا آپ تو میرے ماں اور باپ
دونوں تھے۔ ہائے آپ تو میری ماں تھے۔ میں دوبارہ اپنی ماں سے چھوٹ گئی
دنیا میں کتنے مرد ہیں جو یتیموں کے باپ ہی نہیں بے ماں کے بچوں کی ماں بھی
بن کر دکھائیں۔۔۔۔۔؟